پبلک سیفٹی ریزر

(طنزیہ مضامین)

ابراہیم جلیس

گوشۂ ادب لاہور

بار اول ۱۹۵۰ء
تعداد ایک ہزار
قیمت تین روپے
بیست بیرست

مطبوعہ : انشا پریس لاہور
باہتمام : ملک مبارک علی
پبلشرز : گوشۂ ادب لاہور

فاطمہ کے نام

فہرس

ہاتھ ملائیے

آخر سلیم صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا

"اچھا بھئی چل دیئے۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ سلیم صاحب۔"

"بھئی ہاتھ تو ملاؤ یار۔"

"اوہ معاف کیجئے سلیم صاحب۔ بھول گیا تھا۔ لائیے ہاتھ۔"

میں بچنا چاہتا تھا۔ بچ نہ سکا۔ مجبوراً ہاتھ ملانا ہی پڑا۔ مگر اب تو میں تنگ آگیا ہوں اس ہاتھ ملانے کی حماقت سے جی اتنا اکتا گیا ہے کہ کبھی کبھی تو یہ بھی سوچتا ہوں۔ کہ اپنے ہاتھ ہی کٹوا ڈالوں۔ روز روز، گھڑی گھڑی، ہر شخص سے ہاتھ ملانا، آخر کیا لغویت ہے؟ کیا حماقت ہے؟ کونسی بدعت ہے؟ بات بات پر ہاتھ ملایا جا رہا ہے۔ دن

پچاس آدمیوں سے ملایا جا رہا ہے۔ بیٹھتے ہوئے ہاتھ ملائیے۔ اُٹھتے ہوئے ہاتھ ملائیے۔ زندگی بھر ہاتھ ملاتے رہیئے۔ مرتے ہوئے ہاتھ ملائیے۔

ہاتھ کی اِس زائد اور خواہ مخواہ کی مصروفیت کے نتیجے کے طور پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ان اہم کاموں میں جو انسان اپنے ہاتھوں سے انجام دیا کرتا ہے۔ اچھی خاصی کمی اور سستی پیدا ہو گئی ہے جس کو بادی النظر میں یا عام طور پر محسوس نہیں کیا جا رہا ہے اگر ہاتھ ملانے کی یہ رسم یا عادت یا حماقت انسان میں گہری جڑیں پکڑتی چلی جائے تو مجھے اس زمانہ میں ضرور یاد فرمائیے۔ جب انسان ہاتھ سے صرف ہاتھ ملانے کا کام لیا کرے گا اور ساری دُنیا مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔

ممکن ہے کہ آج میری یہ پیشین گوئی آپ کی تفنن طبع کا باعث ہو مگر جناب یہ بھی تو ایک مذاق یا ہنسی کی بات ہے کہ آپ اچھے خاصے بھلے چنگے کھڑے تھے۔ اور آپ نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ آپ کا ہاتھ بڑھتا دیکھ کر میں جو کہ بہ ہوش و حواس آپ کے سامنے کھڑا تھا۔ اپنا ہاتھ بھی بڑھانے پر مجبور ہو گیا۔ پھر ہم دونوں نے ہاتھ ملائے اور چھوڑ دیئے۔ اب ذرا تصور کی آنکھوں سے اپنے آپ کو ہاتھ ملاتا ہوا دیکھئے اور ہاتھ ملانے کی اس حرکت کا نفسیاتی تجزیہ کیجئے تو آپ کو یقیناً ندامت سی ہو گی کہ آپ سے یہ آخر کیسی مضحکہ خیز حرکت سرزد ہو گئی۔

مگر مجھے یقین ہے کہ آپ اس حرکت کے نفسیاتی تجزیہ کرنے کی دماغ سوزی سے بچنے کے لئے ہاتھ ملانے ہی کو ترجیح دیں گے اور یہ رازجوں کا توں مستور ہی رہے گا

کہ ہاتھ ملانا ہماری سماجی زندگی کا سب سے بڑا تصنع اور سب سے بڑی حماقت ہے۔ میں نے بعض سمجھ دار اور مجھ سے زیادہ عقل رکھنے والے معدودے چند بزرگوں سے پوچھا کہ حضرت یہ تو بتلایئے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے آخر کیوں ہاتھ ملاتا ہے ——؟ ظاہر بات ہے کہ میرے اس سوال پر تقریباً سبھی بزرگ پہلے مسکرائے اور بعد کو یوں گویا ہوئے کہ اس سے خلوص میں اضافہ ہوتا ہے محبت زیادہ ہوتی ہے۔ دوستی بڑھتی ہے، غیریت دور ہوتی ہے —— اپنے سوال اور بزرگوں کے اس جواب کی روشنی میں انسان کے اس سماجی فعل پر بہت غور کیا ہے۔ بہت باشعور رہو کر اس کے عملی تجربے بھی کئے۔ مگر سچ پوچھئے تو مجھے کبھی یہ محسوس نہ ہو سکا کہ ہاتھ ملانے سے خلوص، محبت، یا دوستی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہاتھ بالکل مادی چیز ہے اور خلوص دوستی یا محبت غیر مرئی چیزیں —— جبلی فعل کو الگ رکھ کر ہم ان مرئی اور غیر مرئی چیزوں کے باہمی ربط پر غور کریں تو گمان بھی نہیں ہوتا کہ ہاتھ ملانے کا عمل دوستی محبت اور خلوص پر کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر ڈال سکتا ہے۔ لیکن اب چونکہ دنیا کے سارے کے سارے انسان اس فضول عادت میں مبتلا ہو گئے ہیں اور جیسی کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ سے

جاکے کابل میں آم کا پودا
کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا

بالکل اسی طرح یہ بھی ایک ٹھوس اور اٹل حقیقت ہے کہ انسان جب تک انسان ہے اس عادت سے باز نہیں رہ سکتا اور اس نے جھینپ مٹانے کی خاطر یہ جواز پیش کر دیا

ہے کہ ہاتھ ملانے سے خلوص بڑھتا ہے۔ محبت میں زیادتی ہوتی ہے اور جانے کیا کچھ ہوتا ہے۔

اچھا چلئے۔ تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کئے لیتا ہوں کہ ہاتھ ملانے سے خلوص بڑھتا ہے۔ مگر جناب ہاتھ ملانے سے چھوت چھات کی جو بیماریاں بڑھتی اور پھیلتی ہیں۔ ان کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے؟

میں اس جگہ کوئی جھوٹا قصہ نہیں سناؤں گا۔ بلکہ ایک سچا واقعہ بیان کروں گا۔ کہ میرے ایک دوست کو جذام کی بیماری اسی لئے لگ گئی کہ وہ اپنے ایک جذامی دوست سے ہر سلام علیک پر ایک بار اور "خدا حافظ" پر دوسری بار ہاتھ ملایا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں بھی جذام کی بیماری لگ گئی اور اب وہ ہر "سلام علیکم" اور ہر خدا حافظ پر دوسروں کو جذام تقسیم فرما رہے ہیں۔ ان سے ہاتھ ملانا گویا باضابطہ طور پر جذام کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے برابر ہے۔

اچھا جذامی ہاتھوں کی باتوں کو یہیں چھوڑیئے۔ کیونکہ بعض طبیعتیں نازک ہوتی ہیں اور ایسے ذکر اذکار سے متعفن ہو جاتی ہیں مگر مجبوری یہ ہے کہ میری طبیعت ہاتھ ملانے کی حرکت ہی سے متعفن ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ ہاتھ جذامی ہو یا غیر جذامی ——— یہ میں جانتا ہوں کہ جذامی ہاتھ ابھی اقلیت میں ہیں اور ان کا خاص طور پر ذکر کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔ مگر جو ہاتھ جذامی نہیں ہیں۔ وہ کیا کچھ کم گھن پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً میرے ایک اخبار نویس دوست ہیں۔ ان کا نام قدرت اللہ والد کا نام صبغت اللہ ——— عمر

اٹھائیس سال۔ وُہ جب بھی مجھ سے ہاتھ ملاتے ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے ہاتھ میں کوئی لِج لِجا مینڈک پکڑ لیا ہو ــــ ٹھنڈے ٹھنڈے بھیگے بھیگے ہاتھ ــــ خدا گواہ ہے کہ ان اخبار نویس صاحب سے ہاتھ ملانے کے بعد میں اس وقت تک سگرٹ نہیں پیتا، جب تک کہ صابن سے ہاتھ کو اچھی طرح دھو نہ لوں۔ یا اگر وُہ بہت مجبور کر کے سگرٹ آفر کرتے ہیں تو میں اُلٹے ہاتھ کی انگلیوں میں سگرٹ پکڑتا ہوں اور یہ ہاتھ ملانے ہی کا فیض ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کو اُلٹے ہاتھ سے استعمال کرنے پر بھی مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔

اچھا اور میرے وُہ دوست جو بلاناغہ رات کو کھانا کھانے کے بعد بقول خود کچھ گپ شپ لڑانے میرے گھر آجاتے ہیں۔ ان کا ہاتھ ــــ معاذ اللہ ان کا ہاتھ ــــ ان کا قابلِ رحم سوکھا مریل ہاتھ ــــ مگر سبحان تیری قدرت کہ وُہ بھی ہاتھ ملاتے ہیں اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ہاتھ نہیں ملایا ہے بلکہ یک مشت پوست و استخوان اپنے قبضہ میں کیا ہے۔

تیسرا ہاتھ مولوی صدر الدین خاں کا ہاتھ ہے اور مولوی صدر الدین خاں صاحب کے ہاتھ کی کیا بات ہے۔ اس ہاتھ کو آپ گنگنا نیم گرم، یا "لیوک وارم" ہاتھ کہہ سکتے ہیں اور جب ان سے ہاتھ ملایئے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یا تو صدر الدین صاحب کو بخار ہے یا آپ کو ــــ مگر صدر الدین خاں صاحب کو اپنے گرم خون پر بہت ناز ہے۔ وُہ کبھی یہ محسوس نہیں کرتے کہ آخر دوسرے کے ہاتھ کو بھٹی میں کیوں جھونکا جائے۔

چوتھا ہاتھ:۔ سوامی گورو ناتھن وینکٹیا رامیا آئینگار" کا ہے۔ ان کی ہتھیلیوں سے سدا پانی یا پسینہ چھوٹتا اور نچڑتا رہتا ہے۔ سوامی گورو ناتھن وینکٹیا رامیا آئینگار صاحب اپنے آپ کو بڑا خلیق مدراسی آدمی تصور کرتے ہیں۔ اس لئے انہیں ہاتھ ملانے کا بڑا شوق ہے۔ سوامی گورو ناتھن وینکٹیا وغیرہ وغیرہ صاحب سے میری کچھ زیادہ بے تکلفی نہیں ہے۔ ورنہ کسی اچھے سے موڈ میں ضرور عرض کردیتا کہ میرے بھائی ـــــ آخر یہ تمہارے پسینے کا شریک کیوں؟

اب ہاتھ ملایئے رام نواس لاہوٹی سے ـــــ یہ ہاتھ ہے یا ربڑ کی تھیلی۔ بادی کا ہاتھ۔ چربی کا ہاتھ۔ بنیا ہاتھ ـــــ ہاتھ میں جیسے ڈبل روٹی آگئی ہو۔ ایک بار ہاتھ ملانے کے بعد دوسری بار ملانے کی قطعاً ہمت نہیں ہوتی۔ مگر کریں تو کیا کریں ـــــ رام نواس جی وقتاً ضرورتاً قرض دے دیا کرتے ہیں۔ جیبنے بھر کی پریشانی دور کرنے کے لئے، اگر ایک دو لمحوں کے لئے ربڑ کی تھیلی سے سابقہ پڑ جاتے تو کیا ہرج ہے اور پھر ہاتھ ملانے سے خلوص بڑھتا ہے نا ـــ!

اوہ یہ کون؟ ـــ احسان علی ـــ بھئی بھاگو یہاں سے ورنہ پھر اس سے ہاتھ ملانا ہی پڑے گا۔ اس سے اگر ہاتھ ملا لیا تو خیر نہیں۔ وہ جیسا کہ کشمیری دروازے والے جالندھری حکیم نے فرمایا ہے۔

نکل جائے گا دم کھجاتے کھجاتے

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ احسان علی جو کافی سمجھ دار اور پڑھا لکھا آدمی ہے۔ کتنی

سادہ لوحی سے اپنا خارش زدہ ہاتھ ہر ایک کے آگے بڑھا دیتا ہے۔ ہاتھ ملانے سے انکار کرنا گویا اپنی بد تہذیبی کا ثبوت دینا اور اُس کی دل شکنی کرنا ہے اور اگر ہاتھ ملا لیجیئے تو آپ نے آداب و اخلاق فہمی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی دلجوئی کی ہے اور اب اطمینان سے بیٹھ کر کھجایئے اور کھجاتے رہیئے۔

اب یہ دیکھئے ۔۔۔ سنہرا روپہلا ہاتھ یعنی عالی جناب مولانا مولوی نادر علی خاں صاحب کا ہاتھ، یعنی کوڑھی ہاتھ۔ برص میں لتھڑا ہوا ہاتھ ۔۔۔ عالی جناب مولوی نادر علی خاں صاحب میرے استاد محترم ہیں۔ بچپن میں اُنھوں نے مجھے سیپارۂ سیقول تک عربی پڑھائی ہے۔ وضو اور نماز کے ارکان بتلائے ہیں۔ میری تعلیم کا سنگِ بنیاد رکھا ہے۔ حضرتِ محترم کے فیضانِ تعلّم نے خاک کو اکسیر، تانبے کو کندن، ذرّے کو خورشید، پتھّر کو لعلِ سفید، حیوان کو آدم اور ابراہیم کو ابراہیم جلیس بنا دیا ہے۔ اس لیئے ان سے بھی ہاتھ ملانے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔ مگر دبی زبان میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ جب بھی میں ان کا ہاتھ اپنی طرف بڑھتا دیکھتا ہوں۔ تو میرا دم بولا اُٹھتا ہے اور جی اُلٹنے لگتا ہے۔

یہاں چند ہاتھوں کے نمونے پیش کرنے کے بعد ہاتھ ملانے کے نقصانات اور فوائد پر بحث کرنا بالکل لایعنی سی بات ہوگی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ انسان تو بس خلوص کا بندہ ہے۔ محبت کا بھوکا ہے۔ میرے آپ کے کہنے سے وہ ہاتھ ملانا چھوڑ دے گا۔ ہاتھ ملانے کے فوائد و نقصانات پر اجمالی یا تفصیلی بحث کرنے کے بجائے اگر

بحث کا موضوع اس سوال کو بنا لیا جائے کہ آیا ہاتھ ملانے کی حرکت انسان کی عادت ہے یا رسم —؟ تو ہماری معلومات میں گراں بہا اضافہ ہو سکتا ہے۔ مؤرخین صاد کریں یا نہ کریں یہ تو بہر حال ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہاتھ ملانے کا فعل ابتدا ہی میں ایک رسم ہی کی حیثیت سے معرضِ وجود میں آیا اور بعد کو یہ رسم انسان کی جبلت میں داخل ہو گئی یا اس کی عادت بن گئی اور اب تو یہ عادت بلاقیدِ عمر و مرتبہ انسانوں میں ہمہ گیر ہے۔ بوڑھا بھی ہاتھ ملاتا ہے۔ نوجوان بھی ہاتھ ملاتا ہے۔ عورت بھی ہاتھ ملاتی ہے۔ بچہ بھی ہاتھ ملاتا ہے۔ جہاں تک بزرگوں کا تعلق ہے۔ وہ تو خاص اہتمام سے بچوں یا نئی پود کو یہ عادت سکھاتے ہیں۔ اس کی کافی مشق بہم پہنچاتے ہیں۔ آپ تو روزمرہ دیکھتے ہی ہوں گے کہ کسی کے گھر کسی سے ملنے جائیے۔ آپ کی آمد یا دستک پر باہر نکلتے ہی وہ پہلے آپ سے ہاتھ ملائے گا اور اسی اثنا میں چھوٹا بچہ اگر باہر آ جائے تو وہ اپنے بچے سے کہے گا۔

"یہ دیکھو تمہارے چاچا — چلو منو چاچا کو سلام کرو اور ان سے ہاتھ ملاؤ۔ کم آن شیک ہینڈس با یو شیک ہینڈس"۔ اس کے بعد وہ بچہ کا ننھا سا ہاتھ زبردستی آپ کے ہاتھ سے ملا دیتے ہیں اور آپ با دلِ ناخواستہ مسکرا کر بچہ کا گال نوچتے ہوئے قہراً و جبراً تعریف کریں گے :

"واہ بھئی واہ — بڑا ویل ٹرینڈ بچہ ہے — ابھی سے اس کی اتنی اچھی تربیت ہے"۔ تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ عادت ہے اور یہ عادت شراب خوری

یا سگرٹ نوشی کی طرح اکتسابی نہیں بلکہ موروثی عادت۔ اس دُنیا کا ہر جانے والا ہر آنے والے کو اس میں مبتلا کر کے چلا جاتا ہے اور اس طرح یہ چکر گھومتا رہتا ہے۔ آج ہم توکل تم —— کی ضرورت ہی کیا ہے، کہ ایک دن میں کتنے انسان ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ کیونکہ بے شمار انسان بلکہ سبھی انسان روزانہ ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں۔

بعض انسانوں میں ہاتھ ملانے کی عادت شدّت اختیار کر کے مرض میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں لکھنؤ کے ایک مشہور شاعر، خدا انہیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔ مجھے بہت یاد آ رہے ہیں۔ مرحوم کو اچھے شعر کہنے اور ہاتھ ملانے کا مرض تھا۔ مشاعروں میں جب آتے تو ایک ہنگامہ برپا کر دیتے تھے۔ وہ اشعار سُنا رہے ہیں، مشاعرے میں کسی سامع نے بڑھ کر داد دی۔ اب کیا ہے۔ مرحوم شہ نشین سے کودے اور سامعین کو لانگتے پھلانگتے اس سامع کے پاس پہنچے۔ اس سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور پھر دوبارہ لانگتے پھلانگتے شہ نشین پر واپس آ گئے تاکہ دوسرا شعر سُنائیں۔

مرحوم شاعر کے بعد مولوی جہانگیر علی شاہ کا ذکر بھی نہایت ضروری ہے۔ وہ بھی اسی مرض میں نہایت شدّت کے ساتھ مبتلا تھے۔ مولوی جہانگیر علی شاہ صاحب بڑے زندہ دل، بذلہ سنج اور فقرہ باز بزرگ تھے۔ ہر لطیفہ، ہر بات، ہر فقرہ پر مقابل یا مخاطب سے ہاتھ ملا لیا کرتے تھے۔ میں نے حساب لگایا ہے۔ ایک گھنٹہ میں وہ اوسطاً تیس دفعہ ہاتھ ملاتے ہیں۔ مجھے ان سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ جہاں وہ نظر آئے۔ میں بے تحاشا بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔ مگر ایک بار اُن کے ہاتھ لگا اور پنجے میں پھنسا۔ ورنگل میں کوئی علمی ادبی

قسم کا جلسہ تھا۔ ریل میں حیدرآباد ہی سے موصوف کا ساتھ ہو گیا۔ ایک ہی درجہ میں ایک ہی بنچ پر ـــ ریل چلی۔ باتیں چلیں اور ہاتھ چلے ـــ ہر دو منٹ پر کوئی چٹپٹا فقرہ، کوئی ہنسی کی بات، کوئی مزے دار لطیفہ اور پھر ہاتھ ـــ بھونگیر یا جینگاؤں تک میں بڑے صبر و تحمل سے ہاتھ ملاتا رہا۔ مگر جب صبر و شکیب ذرا نہ رہا اور جب ایک حجام کے لطیفے پر انہوں نے جو ہاتھ بڑھایا تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور نہ چھوڑا پھر۔ دو تین منٹ کے بعد جب انہوں نے فرمایا۔

"بھئی میرا ہاتھ چھوڑو"

میں نے عرض کیا۔" واہ قبلہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ورنگل پہنچنے تک یہ ہاتھ میرے ہی پنجے میں رہے گا۔ بھلا بار بار کب تک ملاتا رہوں گا"

میرے اس جواب پر خفیف ہونے کے بجائے انہوں نے ملے ہوئے ہاتھ کو اور گرمجوشی سے دبایا اور اس پر ایک برجستہ لطیفہ سنا دیا اور پھر زیادہ زور سے میرے ہاتھ کو دبا دیا۔

اس واقعے کے بعد سے میں کچھ کچھ قنوطی ہو گیا ہوں۔ یعنی یہ کہ ہاتھ ملانے کی عادت، حماقت یا مرض ہے ہرگز شفا نہیں پا سکتا۔ یہ ایک عالمگیر مرض ہے۔ اگر ہم تصور کی آنکھ سے دنیا کے سارے انسانوں پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں یوں دکھائی دیتا ہے۔ جیسے ہاتھ ملانے کے بہانے دنیا کے سارے انسان ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ جکڑے ہوئے ہیں۔ ایک رشتہ اتحاد میں منسلک ہیں۔ ہم اس بات کو

بہت پسند کرتا ہوں اور مجھے دُنیا کے اس پہلے انسان سے بڑی عقیدت ہو جاتی ہے۔ جس نے پہلی بار اپنا ہاتھ دوسرے انسان کے ہاتھ سے ملایا تھا۔ مجھے دُنیا کا وُہ پہلا انسان بے حد انسان دوست نظر آتا ہے۔

مگر جب سے دنیا میں سرمایہ داری کا رواج پھیلا۔ اس پہلے ہاتھ ملانے والے انسان کا خواب بھی پارہ پارہ ہو کر رہ گیا۔ ہاتھ ملاتے وقت طبقاتی حدود بھی ہاتھوں کے درمیان حائل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً آپ روز دیکھتے ہیں کہ دولت مند، غریب سے، بادشاہ فقیر سے، آقا نوکر سے، مالک مزدور سے، مہاجن کسان سے، افسر چپراسی سے ہاتھ نہیں ملاتے۔ اور جو ہاتھ ملائے جاتے ہیں۔ وُہ یک جنس یا یک طبقہ ہاتھ ہوتے ہیں۔ امیر آدمی امیروں سے، متوسط آدمی متوسط آدمیوں سے، غریب غریبوں سے ہاتھ ملاتے ہیں اور کبھی کوئی ایک طبقے کا آدمی دوسرے طبقے کے آدمی سے ہاتھ ملاتا ہے تو میں اس فعل کو محض ایک تصنّع اور محض ایک دکھاوا سمجھتا ہوں۔ اسی لئے اسی وقت سے مجھے ہاتھ ملانے سے نفرت ہو گئی ہے۔ اب میں ہاتھ ملانے کو اس وقت تک ایک تصنّع ہی سمجھتا رہوں گا۔ جب تک "غیر طبقاتی علاج" نہ قائم ہو جائے۔

میں حتی الامکان کوشش کرتا ہوں کہ اس لعنت سے آزاد ہو جاؤں مگر سوچتا ہوں کہ یہ بہت مشکل ہے۔ ابھی ابھی میں نظامیہ ہوٹل سے اٹھ کر آ رہا ہوں۔ ایک تازہ کوفت میرے ذہن میں ہے۔ میں تیرہ عدد دوستوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ گھر جانے کے لئے اُٹھا تو بُرا ہو دوست محمود علی کا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا دیا اور پھر مصیبت شروع ہو گئی۔ ایک

ہاتھ، دو ہاتھ، تین ـــــ تیرہ!! کسی کے سر پر سے ہاتھ بڑھ رہا ہے تو کسی کی بغل میں سے کسی کے کندھے پر سے تو کسی کی پیٹھ پر سے ـــ خدا تمہیں غارت کرے محمود علی!

ویسے ہاتھ ملانے کے اصل اصول و قوانین تو یہ ہیں کہ ہاتھ صرف حسب ذیل موقعوں پر ملائے جائیں:-

۱- ملاقات پر
۲- رخصت ہوتے وقت
۳- عیدین یا تہوار کے موقع پر
۴- تعارف پر-
۵- شرط بدتے وقت
۶- سازش یا معاہدہ کی تکمیل پر
۷- کشتی لڑتے وقت
۸- تجدید دوستی پر
۹- کسی کی کامیابی پر
۱۰- کسی مزے وار بات پر
۱۱- مرتے وقت-

کامیابی کے موقع پر تو لوگ عموماً پلاؤ کا ہاتھ یا قورمے کا ہاتھ ملاتے ہیں مگر ایسا موقع کبھی کبھی آتا ہے- مگر بار بار ملاقات پر بار بار رخصت ہوتے ہوئے یا ہر مزیدار د

بے مزہ بات پر ہاتھ ملانے کو لوگوں نے بہت غلط طریقے پر اور ناقابلِ برداشت انداز
میں روا رکھا ہے۔ مثلاً ہندوستان اور پاکستان کے رہنماؤں نے اینگلو امریکن سامراج
سے ہاتھ ملایا ہے۔ عوام دشمن عناصر سے ہاتھ ملایا ہے۔

ہم انہیں اور سب کو مشورہ دیں گے کہ اگر واقعی ہاتھ ملانا چاہتے ہو تو پھر ملاؤ
کسی دستِ حنائی سے، دستِ مرمریں سے، دستِ نازک سے، واللہ کیا لطف آتا ہے
اس لطف کو شاعر کی زبان سے سُنو

دل چھین لیا اُس نے ملا دستِ حنائی
کیا ہاتھ ہے، کیا ہاتھ ہے، کیا ہاتھ ہے واللہ

لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کا نام پاکستان ہے اور یہاں کی
عورت کی مشتِ خاک کا ذرہ ذرہ عفت و حیا سے بنا ہوا ہے۔ اس لئے عورت اور
مرد کے جنسی تحریک کے ڈر سے سماج بلکہ ظالم سماج نے عورت اور مرد کو آپس میں ہاتھ
ملانے سے سختی سے منع کر رکھا ہے — یہاں کا مرد عورت کی چوٹی پکڑ سکتا ہے مگر
اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ مجھے اس کا بے حد افسوس ہے۔ میرے دل میں کسی دستِ حنائی
سے ہاتھ ملانے کی بے پناہ خواہش ہے۔ مگر یہ خواہش یا یہ حسرت ایسی ہے کہ اس پر دم نکلے
— ہاتھ ملانا پڑتا ہے تو مردوں ہی سے — اور مردوں سے کیا ہاتھ ملایئے۔ کرخت
ہاتھ، بھونڈے ہاتھ، واہیات ہاتھ۔

اسی لئے ادھر کچھ دنوں سے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ایک نئی تحریک شروع کی

جائے۔ اس تحریک کا نام ہے: "ہاتھ خالی دینا"

جب بھی آپ کی طرف کوئی ہاتھ بڑھائے۔ آپ انجان ہو جائیے۔ آپ کے اس انجان ہونے کے فعل کو اصطلاحی زبان میں "ہاتھ خالی دینا" کہا جائے گا۔ یہ تحریک وقت کی اہم تحریک ہے۔ زمانہ کا جائز تقاضا ہے۔ اگر سارے انسان پوری سنجیدگی سے اور خلوص سے اس تحریک کا ساتھ دیں تو میں یہ دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ مستقبل قریب میں انسان کو بجلیے مینڈک سے ضرور نجات مل جائے گی ـــ ہاتھ لا! استاد کیوں کیسی کہی۔

دماغ چاٹنے والے

میرے ملاقاتیوں کی کوئی تعداد معین نہیں ہے۔ مگر ان میں سے چند ملاقاتی ایسے ہیں۔ جن کے بارے میں رہ رہ کر مجھے یہ خیال آتا ہے کہ کاش اُن سے میری ملاقات نہ ہوتی۔ یا کاش اب اُن سے میری راہ و رسم منقطع ہو جائے۔ یہ ضرور ہے کہ پہلی بار جب میں کسی ملاقاتی سے ملتا ہوں تو عادتاً یہ ضرور کہہ دیتا ہوں کہ "مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" —— یہ جملہ تو بالکل رسمی ہے۔ اس کے معنیٰ و مفہوم اور اُس کی اہمیت پر غور کئے بغیر خود بخود زبان سے نکل جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس جملے سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جائے اور اس لئے بار بار ملاقات کی جائے کہ پہلی بار مجھے ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی تھی ——
ویسے اب میں سچ سچ بتا دوں کہ اب تو اُن ملاقاتیوں سے مل کر مجھے بے حد

کوفت ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ذرا ڈھیٹ بن کر، ذرا بے مروت ہو کر صاف صاف کہہ دوں کہ صاحبان —— میں آپ سے ہرگز نہیں ملنا چاہتا تب مجھے آپ سے مل کر نہ پہلی بار کوئی خوشی ہوئی تھی، اور نہ اب ہوئی ہے اور نہ آئندہ کبھی ہو سکتی ہے۔ میں بڑی عاجزی سے درخواست گزار ہوں کہ مجھے معاف کیجیے اور خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دیجیے۔

لیکن کیا اب میں ایسا کہہ سکتا ہوں؟ نہیں نہیں شائد میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ میں لاکھ کوشش کروں۔ تب بھی ایسا نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ مجھ میں وہ اخلاقی جرأت ہی نہیں ہے۔ جس کی ہر بڑے آدمی نے تلقین کی ہے اور جو ابتدائے آفرینش سے آج تک (پیغمبروں اور غیر معمولی آدمیوں کو چھوڑ کر) کسی انسان میں پیدا نہ ہو سکی —— اس دُنیا سے آب و گِل میں اخلاقی جرأت کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ جتنی کہ اخلاقی بُزدلی کو حاصل ہے۔ اخلاقی بزدلی کے لئے دل گردے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اخلاقی جرأت رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ لیکن چونکہ میرے دل گُردے بہت کمزور ہیں اور فطرتاً تن آسان بھی ہوں۔ اس لئے مجھ میں اخلاقی جرأت پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ہر زید، بکر، عمر سے پہلی ملاقات پر میں بے کھٹکے یعنی بغیر سوچے سمجھے کہہ دیتا ہوں کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔

مگر از راہِ انصاف آپ فرمائیے کہ سید شاہ ضیاء الحسن سے مل کر کسی صحیح عقل و دماغ رکھنے والے انسان کو خوشی ہو سکتی ہے؟

مجھے اپنے دوست محمد ریاض خاں پر بے حد غصّہ آتا ہے کہ جس نے سیّد شاہ ضیاء الحسن سے ایک مبارک یا منحوس دن میرا تعارف کرایا۔ یہ کوئی سخن سازی نہیں بلکہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جس دن بھی سیّد شاہ ضیاء الحسن سے کسی شخص کا تعارف ہوگا۔ وہ دن اُس شخص کے لیے یقیناً ایک منحوس دن ہوگا۔ چنانچہ میری زندگی میں اب اس منحوس دن کے علاوہ روز بروز منحوس گھڑیوں کا اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ کیونکہ سیّد شاہ ضیاء الحسن روز روز مجھ سے ملتا ہے۔ میں جتنا اُس سے دُور بھاگتا ہوں۔ وہ اتنا ہی تیزی سے میری طرف دوڑتا ہے۔ مجھے پکڑ لیتا ہے اور مجھے اپنی شکست مان کر مجبوراً دانت کھول کر مسکرانا پڑتا ہے اور پھر میں پوچھتا ہوں۔

"اوہ۔ سیّد شاہ ضیاء الحسن صاحب۔ کیسے مزاج تو اچھے ہیں؟" اب پھر کچھ نہ پوچھیے۔ سیّد شاہ ضیاء الحسن کی زبان چلنے لگتی ہے۔ اُس کی زبان جب چلنے لگتی ہے تو پھر گھنٹوں چلتی رہتی ہے۔ رُکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ آپ بیٹھیے اور اپنے صبر و ضبط کا امتحان دیتے رہیے۔ نتیجتاً ناکامی آپ کو یا مجھے ہی ہوگی۔ سیّد شاہ ضیاء الحسن کبھی ناکام نہیں ہو سکتا۔

وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ چونکہ وہ دو دو تین تین گھنٹوں تک بے تکان گفتگو کر سکتا ہے اور سننے والے چُپ چاپ اُس کی باتیں سنتے رہتے ہیں تو یقیناً اس کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ جبھی تو لوگ اپنے زخمِ جگر کو دیکھنے کی بجائے ہمہ تن گوش ہوکر بڑے انہماک سے اُس کی باتیں سُنتے رہتے ہیں۔ سیّد شاہ ضیاء الحسن کبھی یہ جاننے

یا محسوس کرنے کی کوشش نہیں کرے گا کہ آپ کس موڈ میں ہیں۔ وہ اس کی کبھی پروا نہیں کریگا
کہ آپ کو بخار اور درد سر ہے۔ یا آپ اپنی محبوبہ کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ اسے
تو بس یہ خوش فہمی ہے کہ وہ بڑا دلچسپ باتونی یا ایک اچھا مجلسی آدمی ہے۔ اسی لئے
وہ باتیں شروع کر دیتا ہے۔ ہر قسم کی باتیں، ہر موضوع کی باتیں، ایمان کی باتیں، توران
کی باتیں، مہمل باتیں، بیکار باتیں ـــــ ضیاء الحسن باتیں ہی باتیں کرتا رہتا ہے۔ مگر!
نزدیک سے بغور دیکھنے پر بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ باتیں نہیں کر رہا بلکہ اپنے مخاطب کا
دماغ چاٹ رہا ہے۔

میں مانتا ہوں کہ انسان کے حلق میں زبان اسی لئے جڑ دی گئی ہے کہ وہ باتیں
کرے۔ باتیں کرنا ہرگز کوئی غیر انسانی حرکت نہیں۔ مگر مجھے یہ کہنے میں ذرہ برابر بھی
باک نہیں ہے کہ دماغ چاٹنا یقیناً غیر انسانی حرکت ہے۔

ضیاء الحسن جب کبھی ملتا ہے تو پہلے یہ ضرور کہہ دیتا ہے کہ "نہیں نہیں کوئی
خاص بات نہیں۔ بس ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا۔ تم سے دو ایک منٹ کے لئے
باتیں کرتا چلوں۔"

اب سنئے اس کی دو ایک منٹ کی باتیں۔

"ارے بھئی ـــ کچھ سنا تم نے ـــ ابھی ابھی ایک بڑا افسوسناک واقعہ ہوا۔ وہ
موہن لال ہے نا ـــ چلتی موٹر سے گر پڑا۔ بیچارے کو بڑی سخت چوٹ آئی۔"

میں پوچھتا ہوں۔

• کون موہن لال —؟

وہ حیرت سے کہتا ہے —" ارے موہن لال کو نہیں جانتے - ہاں ہاں موہن لال کو تم نہیں جانتے - تم اُس سے کبھی ملے ہی نہیں - موہن لال بے چارا ایک بڑا پیارا دوست ہے - ڈپٹی دیا نرائن کا بھانجا - بڑا دلچسپ ہنس مکھ — بالکل ڈپٹی دیا نرائن کی طرح خوش مذاق اور زندہ دل — ہے ہے - ڈپٹی دیا نرائن کی کیا تعریف کی جائے ابھی ابھی پچھلی جولائی میں وہ سورگباش ہوئے ہیں — بڑی حسرتناک موت تھی — ہاں اس حسرتناک موت پر خوب یاد آیا - وہ بے چارا قمر الدین بھی تو مر گیا - اس کی موت بھی بڑی دردناک تھی - قمر الدین کو بھی شاید تم نہیں جانتے - بے چارے کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے -

ارے ہاں بھئی - تمہارے چھوٹے بچے کا مزاج اب کیسا ہے؟ کون سے ڈاکٹر کا علاج کروا رہے ہو - آج کل تو یہاں کوئی اچھا ڈاکٹر رہے ہی نہیں - سب نیم حکیم خطرہ جان ہیں - اب تو یار میرے علاج کرنے والے بھی ڈاکٹر ہیں اور کالج پڑھانے والے بھی ڈاکٹر ہیں - اس پر ایک بات یاد آئی - وہ جو ڈاکٹر فاروق حسین جو معاشیات کے پروفیسر تھے - انہوں نے استعفیٰ دے دیا ہے - بڑا خوددار آدمی تھا - میں نے اپنی زندگی میں دو ہی خوددار آدمی دیکھے ہیں - ایک تو ڈاکٹر فاروق حسین، دوسرا اپنا محمد قاسم طبلہ مرچنٹ - تم نے محمد قاسم طبلہ مرچنٹ کا وہ واقعہ تو ضرور سنا ہوگا کہ ایک بار انہوں نے ایک بڑے رئیس کا طبلہ درست کرنے سے اس لئے انکار کر دیا

تھا کہ رئیس نے دکان کے باہر ہی سے موٹر میں بیٹھے بیٹھے بڑی رعونت سے کہا تھا کہ ــــ

"اے میاں طبلے والے، ادھر آؤ۔ اسے درست کرنا ہے"

محمد قاسم خوددار آدمی تھا۔ اُس نے ویسے دوکان میں ہی بیٹھے بیٹھے کہا۔

"غرض پڑی ہے تو موٹر سے اُتر کر یہاں آؤ۔ ورنہ اپنا راستہ ناپو۔" یہ ہے خودداری ــــ تجارت کرتا ہے۔ آزاد پیشہ آدمی ہے۔ وُہ بھلا کسی رئیس کا ذلیل کیوں بنا ہو۔ وُہ تو اس وقت ۔۔۔۔ ۔ ارے بھائی چلیں، اٹھ کھڑے ہوگئے۔ اماں یار بیٹھو ــــ کہاں جا رہے ہو، بیٹھو بھئی بیٹھو۔

مگر میں نے جواب دیا کہ مجھے ساڑھے گیارہ بجے ایک صاحب سے ملنا ہے۔ معاف کرنا ضیاء الحسن، میں محمد قاسم طبلچی کی داستانِ خودداری پوری طرح نہ سُن سکا۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں، ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے اُن صاحب سے ملنا ضروری ہے اور اب گیارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ اچھا پھر ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ

اس کے بعد میں وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا ہوں۔ یہ بالکل جھوٹ ہے کہ ساڑھے گیارہ بجے مجھے کسی صاحب سے ملنا ہے، مگر یہ بالکل سچ ہے کہ مجھے زخمی موہن لال یا اُن کے خوش مذاق، زندہ دل ماموں ڈپٹی دیا نرائن آنجہانی یا چھوٹے چھوٹے بچوں والے مرحوم قمرالدین یا ڈاکٹر فاروق حسین سابق پروفیسر معاشیات اور خوددار طبلہ مرچنٹ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ موہن لال جیسے میں جانتا تک

نہیں تھا۔ بھئی اگر موٹر سے گر پڑا تو میں کیا کروں؟ ڈپٹی دیا نرائن بڑے خوش مذاق اور زندہ دل آدمی تھے، تو وہ ہوں گے۔ فخرالدین کی موت بڑی حسرتناک تھی تو بھئی اس کی موت میں میرا کیا دخل ہے؟ ڈاکٹر فاروق حسین نے استعفیٰ دے دیا، تو میرا کیا بگڑا محمد قاسم طبلہ والے اگر خوددار ہیں تو ہوا کریں۔ مجھے تو اُن سے طبلہ درست نہیں کرانا ہے۔

مجھے صرف اکیلے ضیاءالحسن ہی سے شکایت نہیں ہے۔ بلکہ ضیاءالحسن کے سارے بھائیوں سے شکوہ ہے۔ میرا روئے سخن ضیاءالحسن کے سگے یا رشتے کے بھائیوں کی طرف نہیں ہے بلکہ میری ضیاءالحسن کے پیشے کے بھائیوں یعنی ضیاءالحسن کی طرح دماغ چاٹو لوگوں سے ہے۔ دماغ چاٹنا نہ صرف ایک پیشہ ہے بلکہ اس کا شمار فنونِ لطیفہ میں بھی ہوتا ہے۔

سید شاہ ضیاءالحسن کے ایک ہم پیشہ بھائی ابوالفضل صاحب ہیں۔ یہ ابوالفضل صاحب کسی ضلع کی ایک تحصیل کے پیشکار ہیں۔ اپنی کسی نہ کسی کارروائی کے سلسلے میں ہر اٹھوارے، پندھواڑے شہر آتے رہتے ہیں اور جب بھی مجھ سے ملتے ہیں تو پہلا سوال یہ کرتے ہیں۔

"میاں تم کب آئے؟"

میں جواب دیتا ہوں "جی میں تو یہیں ہوں۔ عرصے سے یہاں رہتا ہوں میں تو پانچ سال سے کسی چھوٹے سے سفر پر بھی نہیں گیا!"

وہ فرماتے ہیں: "اوہ۔ وہ شاید آپ کے بھائی ہیں جو بمبئی میں ہیں۔" میں کہتا ہوں "جی میرے تو کوئی بھائی بمبئی میں نہیں ہیں۔" وہ مُصر ہو جاتے ہیں: "ارے کوئی تھے نا میاں تمہارے بمبئی میں۔" اب میں اُن سے کس طرح بحث کروں۔ اس لئے جھوٹ موٹ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں: "اچھا آپ عابد حسین کو پوچھ رہے ہیں۔ جی، وہ تو بمبئی میں فلم ایکٹر بن گئے۔" (حالانکہ عابد حسین تو یہیں ہیں اور یہیں ایک دفتر میں ملازم ہیں) وہ خوش ہو کر فرماتے ہیں: "ہاں میں نے کہا تھا ناں۔ اچھا اب آپ کیا کر رہے ہیں۔" جی تو چاہتا ہے کہدوں، جھک مار رہا ہوں۔ مگر چونکہ وہ میرے بزرگوں کے ملنے والوں میں سے ہیں۔ اس لئے جواب دیتا ہوں: "جی ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔" فرماتے ہیں: "اخبار کے ایڈیٹر ہو! خوب اچھا آج کل اخباروں میں کیا چھپ رہا ہے؟" ایسے سوال کے بعد اپنا اور اُن کا جی ایک کر دینے کو جاہتا ہے۔ مگر انسان ایک بندۂ مجبور ہے اور وہ نہ صرف تحصیل کے تحصیلدار ہیں۔ مگر میرے بزرگوں کے ملنے جلنے والے بھی ہیں۔

وہ جب کبھی اپنی تحصیل سے شہر آتے ہیں تو اُدھر کئے ہوئے سوالات ہر مرتبہ دہراتے ہیں اور دو تین گھنٹے تک برابر دماغ چاٹتے رہتے ہیں مگر پرسوں میں نے اُنہیں بڑا چکمہ دیا۔ وہ شہر آئے تھے۔ اتفاق سے عابد روڈ پر نظر آ گئے۔ میں سائیکل پر جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر پکارا

"میاں۔ ارے ٹھہرو۔ ٹھہرو بات تو سنو۔"

مگر میں نے بالکل انجان ہو کر پیڈل تیز کئے اور نام پلی سڑک پر مڑ گیا۔ حالانکہ مجھے معظم جاہی مارکیٹ جانا تھا۔

ضیاء الحسن کے تیسرے برادرِ طریقت ہمارے ایک پڑوسی بزرگ بھی محکمہ مالگزاری کے پنشن یافتہ منتظم ہیں۔ انہیں بڑھاپے کی وجہ سے جلدی نیند نہیں آتی۔ اسی لئے بیخوابی کا وقت میرا دماغ چاٹنے میں گزارتے ہیں۔ روزانہ رات کو کھانے کے بعد آ جاتے ہیں اور آتے ہی پہلا سوال یہ کرتے ہیں " سناؤ بابا۔ آج اخبار میں کیا لکھا ہے ؟"

میں کوئی حافظِ اخبار تو نہیں ہوں۔ اس لئے عمداً اخبار اُن کی طرف بڑھا دیتا ہوں۔ مگر وہ اخبار جوں کا توں واپس کرتے ہوئے فرماتے ہیں " اخبار تو میں صبح کا ہی پڑھ چکا ہوں۔ اس میں کیا رکھا ہے، کچھ تو سناؤ۔ اسٹالن ہندوستان پر کب حملہ کرنے والا ہے ؟"

میرا ارادہ ہے کہ کسی دن جب میرے صبر و تحمّل کا پیالہ چھلک جائے گا تو میں اُن سے صاف صاف کہدوں گا کہ قبلہ نہ تو اسٹالن کو باؤلے کتے نے کاٹا ہے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرے اور نہ مجھے کہ میں آپ کے ساتھ بیٹھ کر دو تین گھنٹوں تک اخبار کا آموختہ پڑھوں۔ آپ پنشن یافتہ ہیں۔ آپ کو بے خوابی کی شکایت ہے تو پھر آپ اپنے گھر بیٹھ کر تارے گنتے رہئے۔ میرا جوان وقت کیوں ضائع کرتے ہیں۔ میرا دماغ کہاں اتنا میٹھا ہے کہ آپ بیٹھے چاٹا کیجئے حضرت مجھے سونے

دیجیے۔ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ اپنی بزرگی یا میری سعادت مندی سے ناجائز
فائدہ تو نہ اُٹھایئے۔

ضیاء المحسن کے ایک چہیتے ہم مشرب آرٹسٹ ہیں۔ لوگ انہیں ہر فن مولا کہتے ہیں۔ مگر اُنہوں نے انتہائی سادگی سے اپنا تخلص بے کمال رکھا ہے۔ وہ ایک بہت اچھے شاعر، بہت اچھے افسانہ نگار، بہت اچھے مصوّر، بہت اچھے گویّے اور بہت اچھے لطیفہ گو ہیں۔ بلبل ترنگ بھی بہت اچھا بجاتے ہیں۔ آج کل ناچ بھی سیکھ رہے ہیں۔ مگر ایک اچھائی یا خرابی یہ ہے کہ وہ "سنانے کے مرض" میں گرفتار ہیں جب کبھی میں انہیں نظر آجاتا ہوں تو بس پکڑ کر زبردستی موٹر میں بٹھا کے لے جاتے ہیں۔ حکم ہوتا ہے کہ پہلے چائے سگریٹ پی کر تازہ دم ہو جاؤ۔ چائے پی کر پہلا ہی سگریٹ جلاتا ہوں کہ وہ اپنی تازہ نظم یا غزل شروع کر دیتے ہیں۔ اب میں ہوں کہ بات بے بات واہ واہ کہنے لگتا ہوں۔ پندرہ بیس تازہ منظومات کا اسٹاک ختم ہو گیا تو وہ اندر سے چمڑے کا موٹا بیگ لے آئے۔ اب افسانے شروع ہوتے ہیں۔ رومانوی افسانے، سیاسی افسانے، تاریخی افسانے، جاسوسی افسانے۔

دو بج گئے۔ اندر سے دوپہر کا کھانا آیا۔ کھانا کھاتے کھاتے بھی اپنی نگارشات اور ان کی شانِ نزول زیرِ بحث آجاتی ہے۔ کھانا ختم کرنے کے بعد بچے کھچے مقالے تقریریں، اقتباسات، ڈائری، کچھ بڑے لوگوں کے خطوط اور کچھ فرضی لڑکیوں کے محبت نامے۔ لیجئے اب پانچ بج گئے۔ شام کی چائے آتی ہے۔ شام کا وقت چونکہ

نثر نظم کے سے وزنی پروگراموں کے لئے موزوں نہیں ہوتا۔ اس لئے لطیفہ گوئی اور بیت بازی شروع ہو گئی۔ رات کے آٹھ بج گئے۔ اندر سے رات کا کھانا کھاتے ٹیبل ٹاک ہوتی ہے۔ نو بج جاتے ہیں۔ اب ذرا سکوت اور سناٹا طاری ہو جاتا ہے مگر اس پر بھی مصوری کے شہکار دکھانے لگے۔

"یہ تاج محل ہے، یہ نخلستان ہے، یہ نسیم جونبر کی تصویر ہے۔"

"یہ ایک لڑکی کی تصویر ہے جس کا چہرہ عشق کی ناکامی کے تاثرات ظاہر کرنے کی میں نے انتہائی کوشش کی ہے۔"

"میری یہ تیندوے کی تصویر — اب کے سال بمبئی کی آرٹ اگزبیشن میں بھیجی جانے والی ہے۔"

خدا خدا کر کے رات کے دو بج گئے۔ دو بجے سے موسیقی کا پروگرام شروع ہو گیا۔ پھر رات کے پانچ بج گئے۔ اب بلبل ترنگ پر بھیرویں بجانے لگے۔ یہ مجلسِ راگ و رنگ ابھی جاری تھی کہ قریب ہی کسی ٹاپے سے مرغ بول پڑا۔ ایک مسجد سے مؤذن کی اذان گونجی۔

فرمایا: "ارے دیکھا تم نے۔ آرٹسٹ کو گردشِ شام و سحر کی کوئی خبر نہیں ہوتی اچھا، ارے تمہاری آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔ اب تم سو جاؤ۔ میں ذرا شفق کا نظارہ کر لوں"

میں سوچتا ہوں کہ کیا میں سو جاؤں؟ — مگر شائد میں نہ سو سکتا ہوں اور نہ سوچ سکتا ہوں کیونکہ میرے سر میں جتنا کچھ مغز تھا۔ آرٹسٹ نے سارے کا سارا چاٹ لیا ہے۔ اب مجھے

کیا کرنا چاہیئے!

اب مجھے یہ کرنا چاہیئے کہ جب بھی مجھے دوبارہ آرٹسٹ صاحب سے ملنا پڑے تو پہلے ہی اپنی بیوی بچوں کو وصیت کر آؤں۔ تا کہ پھر میں بھی آرٹسٹ بن جاؤں اور مجھے گردشِ شام وسحر کی خبر ہی نہ ہو۔ ظاہر بات ہے۔ کہ جب سارا دماغ چاٹ لیا جائے گا۔ تو پھر گردشِ شام وسحر کی خبر ہی نہ ہو گی۔

ضیاء الحسن صاحب کے پانچویں بھائی چودھری رام کشن جی ہیں۔ بہت بچپن سے میرے ساتھ پرائمری جماعت میں پڑھتے تھے۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد وہ اپنے بابا کی کپڑے کی دوکان پر بیٹھ گئے۔ پھر زمانہ گزر گیا۔ میں نے بی، اے پاس کر لیا۔ اس کا رام کشن جی کو بھی پتہ چل گیا۔ وہ مجھے بڑا لائق آدمی سمجھنے لگے اپنے کاروباری خطوط پڑھانے اور لکھانے کے علاوہ اپنے راج پھوڑے کے علاج سے لے کر اپنی لڑکی کی شادی تک ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔ اُن کی گفتگو کا بار بار دُہرایا جانے والا جملہ یہ ہے:۔

"بھئی تم علم وادب کے خوب چرچے کرتے ہو۔ کچھ بتاؤ تو سہی کہ کیا دیسی کپڑوں کے ساتھ ولائتی کپڑوں کی بھی تجارت کر دوں؟"

"کیا چھوٹے لڑکے گرجا کے اسکول میں بھیج دوں؟ یا اپنے سرکاری مدرسہ میں ہی شریک کراؤں؟"

"کیا راج پھوڑے کا اپریشن کراؤں یا دوائیاں ہی کھاتا رہوں؟"

"کیا دیوان خانے کی دیوار اینٹوں سے چنواؤں یا لکڑی کی جالی لگوا دوں؟"

"کیا حقّہ چھوڑ کر سگریٹ شروع کر دوں یا صرف پان کھاؤں؟"

غرضیکہ رام کشن جی ہر روز مجھ سے میری قابلیت کا امتحان لینے کے لئے کوئی نہ کوئی صلاح مشورہ کرنے ضرور آتے ہیں اور محض اس لئے کہ میں بقول اُن کے علم و ادب کے خوب چرچے کر رہا ہوں اور میری کھوپڑی میں بہت بڑا دماغ ہے۔ اب میں رام کشن جی کو کس طرح سمجھاؤں کہ میری کھوپڑی میں جتنا کچھ مغز تھا۔ وہ ضیاء الحسن نے، بیشکار تحصیل نے، پڑوسی بزرگ نے، آرٹسٹ نے اور —— خود آپ نے چاٹ ڈالا ہے۔ اب میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں کہ اپنے راج پھوڑے کا آپریشن کرانا چاہیئے یا نہیں۔

اس لئے اب مجھے معاف کیجئے اور اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!

شاہراہ

اُس غریب آدمی کے بچے کے نام جو شاہراہ پر پیدا ہوا

(۱)

آدمی — اَن گنت آدمی۔ رنگ برنگ کے آدمی۔ شکل شکل کے آدمی۔ جسم جسم کے آدمی — پیدل، سائیکلوں پر، تانگوں میں، رکشاؤں میں، بگھیوں میں، موٹروں پر سوار آدمی — مگر ہیں سب کے سب آدمی۔

آدمیوں کی آوازیں، سائیکلوں کی گھنٹیاں، تانگوں کی کھٹ کھٹ، رکشاؤں کے گھنگرو، موٹروں کے ہارن — عابد روڈ پر زندگی پر شور ہے۔ کپڑوں کی دوکانیں، جوہریوں کی جگمگاتی الماریاں، کتاب خانے، کھلونوں کی دوکانیں، ہیر کٹنگ سیلونس، ٹیلر شاپس، ڈرائی کلینرس، گھڑیوں کی دکانیں، انڈیا کافی ہاؤس، پاکستان ٹی ہاؤس، فرنیچر اسٹال، ریڈیو محل، چائے خانے، اخبار کا دفتر، مسجد، مندر، گرجا، پوسٹ آفس، کالج، مٹھائی گھر

چوڑی فروش، ڈسپنسری، مایوس مریضوں کی امید گاہ، علاجستان، پان بیڑی سگریٹ کے خوانچے، سینما گھر، لکڑی کا ٹال، اتحاد المسلمین کا دفتر، اسٹیٹ کانگریس کا دفتر، پٹرول پمپ، میوہ بیچنے والی طرحدار عورتیں، فٹ پاتھ کے ڈاکٹر، جادو اور مسمریزم بتانے والے کرتب باز، ہینگ اور زعفران بیچنے والے پٹھان، بٹے باز اور گرہ کٹ، اخبار بیچنے والے چھوکرے......

عابد روڈ اس ہاتھ دیتی ہے اس ہاتھ لیتی ہے۔

(۲)

ایک شاندار دوکان کے سامنے ایک شاندار "سٹوڈ بیکر" رکی۔ اس میں ایک نواب اور ان کی "ڈارلنگ" بیٹھے ہیں۔ ایک دیوانی بھکارن، جھریوں دار وحشت ناک صورت والی بوڑھی عورت، ٹانگوں میں ایک پھٹی پرانی کسی مرد کی خاکی پتلون، ننگی سوکھی لٹکتی چھاتیاں — زور زور سے پیٹ پر ہاتھ مار مار کر چیخ اٹھتی ہے۔

اللہ دیا تو دے دے بابا

مگر چونکہ اللہ نے بہت زیادہ دے دیا ہے۔ اس لئے بابا کچھ نہیں دیتا۔

ایک کالا مشٹنڈا آدمی، ٹھگنے قد کا آوارہ آدمی، سیاہ رنگ کی میلی قمیص اور کالے چوخانے والی لنگی، سر پر بغیر پھندنے والی کالے رنگ کی ترکی ٹوپی، پاؤں ننگے اور گرد آلود ہاتھ میں ایک ہاکی اسٹک، منہ میں پان کا بیڑہ، مگر "امپیریل بنک آف انڈیا" کے سامنے سے گذرتے ہوئے گا رہا ہے۔ ع

ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

کالج کے دو لڑکے اس کو موضوع گفتگو بنا کر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اب بہت جلد خاک نشینوں کی ٹھوکروں میں یہ سارا زمانہ ہوگا اور . . .

اور وُہ انڈیا کافی ہاؤس میں گھس جاتے ہیں۔

(۴)

دو بیل ــــ ایک دوسرے کے سینگوں میں رسی بندھی ہُوئی، یعنی ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک، سڑک عبور کر رہے ہیں۔ ان دونوں بیلوں کو دیکھ کر سمجھ دار ہندو اور مسلمان عبرت پکڑ رہے ہیں۔

(۵)

ایک سائیکل سوار، قبل از وقت بوڑھا، دُبلا پتلا، آنکھیں کالی، چہرہ پیلا، پیشانی پر غمِ روزگار کا گراف، کپڑے بوسیدہ اور ناصاف، کیریر پر دفتر کی فائیلوں کا پشتارہ، بائیسکل کھٹارا، ایک ہاتھ ہینڈل پر اور دوسرا پیٹ پر، پیٹ کا مریض یعنی تیسرے درجے کا کلرک ــــ اسے پیچھے اُس کی سائیکل کی زنجیر گر گئی۔ بیچارہ بڑی تکلیف سے اُترا اور پیڈل گھیر کر پھر سے زنجیر چڑھا رہا ہے۔

مگر بیچارے کو زنجیر سے شائد ہی کبھی چھٹکارا نصیب ہو۔

(۶)

ایک جلوس، جس کے آگے ایک لمبا تڑنگا آدمی سبز ہلالی پرچم لیے چل رہا ہے۔

جلوس فلک شگاف نعرے لگا رہا ہے۔

برہمن راج مردہ باد، اسلام زندہ باد

مخالف سمت سے دوسرا جلوس آرہا ہے۔ جلوسیوں کے سر پہ سپید سپید گاندھی ٹوپیاں نظر آرہی ہیں اور فضا میں نعرے آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔

رضاکارانہ تنظیم مردہ باد

برہمن راج مردہ باد

نعروں کے بعد جھنڈے ٹکرائے، جھنڈوں کے بعد ہندو مسلمان ٹکرائے، اور عابد روڈ پر ہندو اور مسلمانوں کا خون مل کر بہنے لگا جس کو انگریز پولیس افسر کی جیپ کار کے ڈنلاپ ٹائرس روندتے ہوئے گزر گئے۔

عابد روڈ پر اب کوئی انسان نہ تھا۔

البتہ عابد روڈ پہ جگہ جگہ انسانی خون کے دھبے پڑے تھے اور ہر خونی دھبہ ایک ایک پولیس کے سپاہی کی پرچھائیں نظر آرہا تھا۔

عابد روڈ ویران اور سنسان تھی۔ اس کا سہاگ لٹ چکا تھا مگر اس کے ماتھے پر آصفیہ پرچم لہرا رہا تھا۔ ہندو کا پرچم نہ مسلمان کا پرچم، عوام کا پرچم نہ انسان کا پرچم بلکہ ایک جاگیردار کا پرچم۔ جو ہندو تھا نہ مسلمان اور نہ انسان — جو صرف جاگیردار تھا۔

(۷)

تین روز بعد عابد روڈ نئی نویلی دلہن نظر آرہی تھی جیسے وہ زرق برق کپڑوں، جگمگاتے زیوروں اور انواع و اقسام کے کھانوں، میووں اور پھلوں کے درمیان سو رہی ہو۔

مگر ایک ہجوم نے اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگا دیا۔

پھر ایک جلوس ـــــ طالب علموں کا، کلرکوں کا، مزدوروں کا، کسانوں کا مشترکہ جلوس جس کے آگے ایک لال جھنڈا فضاؤں میں اونچا ہی اونچا لہرا رہا تھا۔ جلوسی چیخ رہے تھے۔

ہندو مسلم بھائی بھائی
سب کی دشمن نوکر شاہی

پولس کے ہتانے پر نوکر شاہی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور معاً فضا میں سیٹیوں کی آوازیں گونجنے لگیں اور پولیس کے سپاہی لاٹھیاں اور بندوقیں لئے ہجوم میں گھس آئے۔

عابد روڈ پھر سنسان ہوگئی۔ البتہ لیبر بچس کے پاس ایک مزدور دم توڑتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

ہندو مسلم بھائی بھائی
سب کی دشمن نوکر شاہی

مزدور مرگیا۔ نعرہ نہ مرسکا۔ جسم مرگیا، رُوح نہ مرسکی

(۸)

چار کالج کے لڑکے ـــــ پٹرول پمپ کے پاس کھڑے ہیں۔ یہ عابد روڈ کے شہزادے ہیں۔ پہلے یہ کسی جاگیردار کی اولاد تھے۔ اب دن اور رات عابد روڈ کی ہوٹلیں انہیں اپنی آغوش میں پالتی ہیں۔ سرِ شام یہ خوب بنے ٹھنے فٹ پاتھ پر آ کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ آنکھوں کی ٹھنڈک کے مریض ہیں۔ جہاں کسی کار میں کوئی خوبصورت لڑکی نظر آتی ہے اس موٹر کا پلیٹ نمبر نوٹ کر لیتے ہیں اور بس ــــ تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک شہزادے نے پلیٹ نمبروں کی تین تین جلدیں ختم کر لی ہیں اور چوتھی کی تدوین میں پوری عرق ریزی سے مصروف ہیں۔

زندگی ماسکو تک پہنچ گئی ہے اور ابھی یہ خلیفہ ہارون رشید کے بغداد سے باہر نہ نکل سکے۔

اوہ وہ کار ــــ ہائے ہائے شعلہ جوالہ۔ پلیٹ نمبر ۸۲۷۳

ایک مولانا حالی انہیں دیکھ کر یہ شعر گنگنا رہے ہیں۔

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے
تباہ ان کی حالت بُری ان کی گت ہے

(۹)

ایک بوڑھا مارواڑی سائیکل پر چلا جا رہا ہے۔ اچانک ایک مرغی دوڑتی ہوئی آئی اور اس کی سائیکل کے پہیے کی زد میں آگئی۔ بوڑھا مارواڑی سائیکل سے گر پڑا۔ مرغی سائیکل کے پہیے میں پھنس کر پھڑپھڑانے لگی۔ یہ دیکھ کر ایک پان کی دوکان کے پیچھے سے ایک غنڈہ میلے ڈھیلے پاجامے اور کسی کے انعام میں دیئے ہوئے فاختئی رنگ کے بوشرٹ میں ملبوس ننگے پاؤں سڑک پر کود کر آگیا اور سائیکل کے پہیے سے پھڑپھڑاتی مرغی نکال کر بغل میں دباتے ہوئے سیٹھ جی کے آگے ہاتھ پھیلا دیئے۔

"سیٹھ جی ایک روپیہ بارہ آنے۔"

بیچارا مارواڑی اپنے کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی پگڑی سنبھالی۔ سائیکل اٹھائی مگر غنڈے نے سائیکل کا ہینڈل پکڑ لیا اور بولا۔

"سیٹھ جی پہلے ایک روپیہ بارہ آنے رکھ کر بات کرو ادھر۔"

مارواڑی کھسیانا ہو گیا اور پوچھا

"بھئی کا ہے کے ایک روپیہ بارہ آنے۔"

غنڈے کے دوست غنڈوں نے کہا۔ "اجی مرغی مر گئی تمہاری سائیکل سے سمجھے سیٹھ جی۔"

مارواڑی نے بوکھلا کر کہا۔ "کہاں مری ہے مرغی۔ یہ تو زندہ ہے۔"

غنڈوں نے کہا۔ "یہ زندہ معلوم ہو رہی ہے آپ کو۔ اچھا جی یہ یوں نہیں مانے گا۔"

مگر ایک شریف اور تگڑے آدمی نے آستین چڑھانے والے غنڈے کو روک لیا اور کہا۔ "بھئی مرغی تو زندہ ہے۔ یہ کہاں کی شرافت ہے۔ بیچارا بوڑھا آدمی سائیکل سے گرا۔ اس کے چوٹیں آئیں اور تم ہو کہ اسے اور تنگ کر رہے ہو۔"

دوسرا غنڈہ بولا۔ "اچھا جی۔ خیر مرغی مری نہیں تو کیا زخمی تو ہو گئی ہے۔ آج زخمی ہوئی ہے تو کل مر جائے گی اور زخمی ہونے کے بعد انڈے کیسے دے گی۔ اچھا چلو ایک روپیہ دلوا دو۔"

بڑی تکرار ہونے لگی۔ مگر سامنے ٹریفک کا سپاہی چپ چاپ کھڑا "آن ڈیوٹی" سگریٹ پیتا ہوا سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔

جب تکرار بہت بڑھ گئی تو شریف مگر تگڑے آدمی کے بیچ بچاؤ کرنے سے مارواڑی

ایک روپیہ اس غنڈے کو دینے پر رضامند ہو گیا۔ مجمع چھٹ گیا۔ مارواڑی اپنی سائیکل سنبھالے آگے بڑھا تو ٹریفک کے سپاہی نے اسے روک لیا اور کہا "سیٹھ جی انعام ——"

مارواڑی نے کہا "کیسا انعام —— ؟"

ٹریفک کے سپاہی نے کہا "مرغی کا انعام —— میں تو ابھی چالان کرنے والا تھا۔ مگر میں نے دیکھا۔ سیٹھ جی ہیں اس لئے . . . " وُہ دانت نکال کر ہنسنے لگا۔

مارواڑی چالان کے نام سے چکرایا۔ ویسے پولیس والے خصوصاً دیسی ریاست کے پولیس والے سے سارے شریف آدمی ڈرتے ہیں۔ اس لئے اس نے چپ چاپ ایک اٹھنی اسے دیدی۔ سپاہی نے دونوں پاؤں جوڑ کر کھٹ سے سلام کیا "سلام سیٹھ جی"

(۱۰)

ایک پردے والی رکشا ایک ہوٹل کے سامنے کھڑی ہے۔ ایک نوجوان بڑی دیر سے اُس کے گرد منڈلا رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وُہ رکشا کے پردے میں مُنہ ڈال کر باتیں کرنے لگا۔ دو نوجوان فٹ پاتھ پر کھڑے اس پر تنقید کر رہے تھے۔

"یار کوئی آوارہ عورت ہے"

"نہیں یار۔ اس کے زانو پر کتابیں میں نے دیکھی ہیں۔ اسکول کی لڑکی ہے۔"

"ارے نہیں بھئی۔ جب سے رنڈیوں کے چکلے شہر سے برخاست کر دیئے گئے۔ ایک جگہ جمع کی ہوئی گندگی اب سارے شہر میں رکشاؤں کی بدولت پھیل گئی ہے۔ یہ عورتیں تو کتابیں اس لئے رکھتی ہیں کہ نوجوان لڑکے یہ سمجھیں کہ کالج گرل ہے۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ رکشا کے پردے میں منہ ڈالے جو نوجوان باتیں کر رہا تھا وہ غڑاپ سے اندر ہو گیا۔ ڈراپ پردہ گر گیا۔ رکشا چلی گئی۔ فٹ پاتھ کے دونوں نوجوان ہنس پڑے

(۱۱)

لاڈلا بیٹا وہ اک ماں باپ کا ۔۔ عمر کوئی سات آٹھ سال۔ خوبرو۔ کالی شیروانی سفید پاجامہ، سفید کینوس کا جوتا۔ بغل میں تیسری جماعت کی کتابیں اور ہونٹوں میں ایک جلتا ہوا سگریٹ۔

ایک مولانا اپنی دبیز شیشوں والی عینک سے اسے گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں ۔۔

اور۔۔۔۔۔

استغفراللہ۔ استغفراللہ

(۱۲)

ایک مزدور جس کے سر پر ایک بڑا ٹرنک، ٹرنک پر ایک سوٹ کیس، سوٹ کیس پر اٹاچی کیس، بغل میں بستر، بستر والے ہاتھ میں ناشتہ دان، ایک بہت بڑے سیٹھ صاحب کے پیچھے چلا جا رہا ہے۔ سیٹھ صاحب تیز تیز چل رہے ہیں اور ان کے پیچھے مزدور تیز تیز دوڑ رہا ہے۔ اچانک، اسے ٹھوکر لگتی ہے اور سارا سامان سڑک پر گر گیا۔ مزدور لہولہان ہو گیا۔ مگر سیٹھ صاحب بڑے برافروختہ اسے ٹھوکروں سے مارنے لگے۔ جب تھک گئے تو انھوں نے ایک تانگہ منگوایا۔ سامان لادا اور خود بھی

سوار ہو کر چل دیئے۔

مزدور نے ان کے آگے ہاتھ پھیلایا۔

"بابوجی —— میری مزدوری"

سیٹھ صاحب غرّائے

"بدمعاش۔ حرامزادے۔ سور۔۔۔۔"

مزدور کا لہو فٹ پاتھ کی مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ مٹی میں جذب ہوتا ہوا یہ لہو زہر بن کر بورژوائی سرزمین کی اس شہ رگ میں، اس عابد روڈ میں جذب ہو رہا تھا۔

(۱۳)

ایک نوجوان انگریز لڑکی، زرد جھلملاتا فراک، مرمریں پنڈلیاں —— اس کے آتے ہی عابد روڈ جیسے رنگین و معطر ہو گئی۔ عابد روڈ پر جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ دوکانوں سے اور موٹروں سے جھانکنے لگے۔ نوجوان رابرٹ ٹیلر کے انداز میں چلنے لگے۔ بعض کار والے زندہ دل نوجوانوں نے اسے اس کی "نامعلوم" منزل تک "لفٹ" دینی چاہی۔ مگر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور انکار کے سوا کچھ نہ تھا اس نے کسی "کالے" کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اچانک "وبکاجی بار" کے پاس اسے "گوروں" کا ایک ملٹری ٹرک نظر آ گیا۔ انگریز اور امریکن گورے اس کو دیکھ کر سیٹیاں بجانے لگے۔ ایک گورے نے آگے بڑھ کر اس سے "سینٹ پال کیتھڈرل" کا پتہ پوچھا۔ وہ پتہ بتانے کے لئے ان کے ٹرک میں بیٹھ گئی۔

اور ٹرک سینٹ پال کیتھڈرل کی طرف چلی گئی۔

عابد روڈ کے سارے "رقیبانِ رُوسیاہ" کے دل میں "اینگلو امریکن سامراج" کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑکنے لگے۔

(۱۴)

سانولی سلونی شام کا ملیح حسن عابد روڈ پر جیسے سحر کر گیا ہے۔ عابد روڈ پر زندگی پُر شور ہے اور رواں دواں ہے۔ معاً فضا میں پولیس کی سیٹیاں گونجنے لگیں اور لوگ باگ سڑک سے فٹ پاتھوں پر ہٹ آئے۔

ع ہٹو بچو کہ سواریٔ شاہ آتی ہے

لوگ دو رویہ دم بخود کھڑے ہیں۔ ابھی سواریٔ شاہ آنے میں کافی دیر ہے۔ مگر رعبِ شاہی عابد روڈ پر ابھی سے طاری ہے۔ کوئی آدمی کوئی سواری اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتی۔ ہر روز یہی ہوتا ہے۔ سواریٔ شاہ جہاں پناہ روز شام کو نکلتی ہے اور روز شام کو عابد روڈ تھوڑی دیر کے لئے قابلِ رحم ڈری سہمی اور پژمردہ ہو کر رہ جاتی ہے

پولیس والا ایک شریف آدمی کو ماں بہن کی گالیاں دے رہا ہے۔ اُس شریف آدمی نے اُس سے یہ کہا تھا کہ ابھی سواریٔ شاہ کے نزول میں کافی دیر ہے۔ میں صرف یہ راستہ عبور کرنا چاہتا ہوں۔ میری بیوی دردِ زہ میں مبتلا ہے اور کیا معلوم یہیں سڑک پر......

مگر پولیس والا کہہ رہا تھا۔

"نہیں نہیں — مجھے آرڈر نہیں۔ کوئی شخص سڑک عبور نہیں کر سکتا۔"

ادھر تانگے میں اُس کی بیوی دردِ زہ سے بُری طرح کراہ رہی تھی اور شریف آدمی بوکھلایا ہوا، پریشان، پسینہ پسینہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

پھر اچانک تانگے میں عورت کی چیخیں بڑی ڈراؤنی آوازیں بلند ہوئیں۔ شریف آدمی رونے لگا۔ مگر پولیس والا سیٹیاں بجا رہا تھا۔

ہٹو۔ بچو کہ سواریِ شاہ آتی ہے

شریف آدمی پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔ کیونکہ تانگے میں اب سکوت، موت کا سا سکوت طاری تھا۔

اعلیٰحضرت بندگانِ عالی کی سواریٔ مبارک تشریف لے آئی اور گزر گئی۔

اور کسی کو پتہ نہ چلا کہ سواریٔ شاہانہ ایک ماں اور ایک نوزائیدہ انسان کو روند کر چلی گئی ہے۔

سلامت رہے بادشاہ ہمارا

گلزار سندیلوی اینڈ کو

جنرل مرچنٹ اردو ادب موچی دروازہ لاہور

روئے سُخن کسی کی طرف ہو تو (میں) سرخُرو

تقسیم ہندوستان کا اثر اُردو زبان و ادب اور اُردو ادیبوں پر جیسا کچھ پڑا ہے اس کا اندازہ کرنا اس لئے مُشکل ہے کہ اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان میں تو حکومت کی طرف سے اُردو کو "دیس نکالا" دیا گیا اور پاکستان میں بیچاری اُردو سرکاری زبان بن گئی۔ مگر سرکاری زبان ہونے کے باوجود بیچاری "مہاجر" ہے کیونکہ پاکستان میں اس کی بہت سی سوکنیں ہیں۔ پنجاب میں پنجابی ہے۔ سندھ میں سندھی ہے۔ سرحد میں پشتو ہے۔ بلوچستان میں بلوچی ہے اور بنگال میں بنگالی — اسی لئے اُردو کو ابھی اس کا اپنا گھر الاٹ نہ ہو سکا اور وہ مجبوراً سرکاری کیمپ میں مقیم

ہے۔ کوششیں کی جا رہی ہیں۔ یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ نوابزادہ لیاقت علی خاں اور خواجہ ناظم الدین تقریریں فرما رہے ہیں کہ اُردو کو ہر گھر میں جگہ ملنی چاہیئے مگر چونکہ تقریریں تو تقریریں ہوتی ہیں اس لئے . . . .

ویسے اُردو کی یہ زبوں حالی کوئی نئی نہیں۔ بہت پُرانی ہے۔ جب سے قلعہ معلّی اُجڑا اور داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی آخری شمع یعنی حضرت بہادر شاہ ظفر کے بعد مغلیہ جاہ و حشم کا شیرازہ بکھر گیا۔ تبھی سے اُردو کی حالت بڑی زار اور بڑی زبوں ہے ہائے ہائے وُہ زبان جس میں حضرت میر تقی میر۔ حضرت شیفتہ۔ حضرت انیس۔ حضرت انشا شاعری فرماتے تھے۔ اُستاد شہ حضرت ذوق اور میرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالبؔ نے جس کی نوک پلک سنواری تھی۔ جو نواب سعادت علی خاں کے گھر میں پلی۔ جسے بیگمات شاہانِ مغلیہ نے لہجہ اور لوچ عطا کیا جو قیصر باغ میں جوان ہوئی — وہی زبان آج بھٹیاروں کے مُنہ میں آگئی ہے۔ بُرا ہو ان ترقی پسند مصنّفین کا — اُنہوں نے زبان کو شاہی درباروں سے نکال کر بیچ بازاروں میں کھڑا کر دیا۔ کہاں یہ زبان شاہزادوں اور شہزادیوں کی تھی اور کہاں یہ زبان مزدوروں اور کسانوں میں آگئی۔ کہاں تو میر تقی میر جیسے اہلِ زبان شاعر تھے اور کہاں ان ترقی پسند مصنفوں نے نظیر اکبر آبادی جیسے پھکڑ شاعر کو بانس پر چڑھایا تھا۔ ان ترقی پسندوں نے جو کچھ کیا جیسے وُہ کم نہ تھا کہ آج تقسیم ملک کے بعد بیچاری اُردو کے پیچھے نئی ساڑستی لگی ہوئی ہے۔ شین قاف تو پہلے ہی بگڑ چکے تھے اور اب یہ خانماں بربادی۔ خدا کی سنوار اس موئے فرنگی لارڈ

ماؤنٹ بیٹن کو جس کی بدولت اب برس روز سے اُردو یوں سڑکوں کی خاک پھانکتی پھر رہی ہے۔

واللہ کیا عرض کریں حضور۔ اب تو اردو کی ساری اُٹھان کا ستیاناس ہو کر رہ گیا ہے۔ نہ وہ صنائع بدائع رہے نہ وہ ضلع جگت۔ نہ وہ تشبیہات نہ وہ استعارے۔ نہ وہ سلطان العلوم رہے نہ سعادت علی خاں کے ادبی دربار رہے۔ نہ وہ مشاعرے ہیں ہیں اور نہ وہ شعر و سخن کی محفلیں ہیں۔ ہائے ہائے حضور۔ اب تو اہلِ فن اُٹھ گئے۔ بس کٹھ ملا رہ گئے۔

دہلی اور لکھنو کے کچھ ٹکسالی اشراف ایسے بھی تھے۔ جنہوں نے اُردو کو اس کا کھویا ہوا مقام پھر سے دلانے کی حتیٰ المقدور کوشش کی۔ مگر نیرنگی زمانہ کی بابت کیا کہیے۔ کہ کل تک جو تُتلانا بھی نہیں جانتے تھے۔ آج اُردو کے بڑے بڑے جغادری ادیب بن بیٹھے ہیں۔ بقول کسے "پڑھے نہ لکھے نام محمد ترقی پسند" اور پڑ گئے اُردو کے پیچھے ڈنڈا لے کے۔ ارے خدا کے بندو۔ اُردو بھی کوئی گائے بکری ہے! غضب خدا کا! یہ صنفِ نازک ہے۔ صنفِ نازک۔ ہوش کے ناخن لو۔ محلوں میں پلی ہوئی نازک اندام کو کہاں عام لوگوں اور عامیوں میں کھینچ لائے۔ جواب اس کا کون دے؟

جانے کس کم بخت نے "ادب برائے ادب" کی بجائے "ادب برائے زندگی" کا نعرہ لگایا اور لگا اردو کے جسم کا سارا زیور لوٹنے۔ صنائع بدائع تشبیہیں استعارے محاورے ضلع جگت سب نوٹ لئے تو پھر اس کے خد و خال بگاڑنے شروع کئے

475806
DELHI PUBLIC
LIBRARY
ادب 847

ہرایرا غیرا نتھو خیرا قسم کا ادیب اب کان پر قلم رکھ کر نکلا اور خرافات نگاری کے پُل باندھنے لگا۔ پہلے کسی اہلِ زبان سے باتیں کرتے اور سُنتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے پھول جھڑ رہے ہیں اور پھول چُنے جا رہے ہیں۔ اور اب یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اردو نہیں بول رہا ہے بلکہ روڑے اور کنکر مار رہا ہے۔ ان ترقی پسند ادیبوں کی کوئی تحریر اُٹھا کر دیکھو تو صاف معلوم ہو جائے گا۔ جھوٹا مصالحہ کھوٹا کام۔ ابھی قبلہ و کعبہ ہم دریافت کریں کہ ادب کا زندگی سے کیا تعلق ہے؟ ادب کا تو صرف ادب سے تعلق ہو سکتا ہے۔ ادب اگر ادب سے متعلق نہ رہے تو پھر وہ کہاں کا ادب اور کیسا ادب۔ یا اگر ادب کے تعلق کے لئے اسی کے شایانِ شان زندگی بھی ہو۔ یعنی بادشاہوں کی زندگی امرا کی زندگی ـــــ یہ فضلو خیرو کی زندگی سے اردو زبان و ادب کو کیا تعلق۔!

اب اللہ میاں ہی ان ترقی پسند ادیبوں سے سمجھیں۔ ایک دو حرف کیا لکھنا آیا کہ بس خود کو شیخ معجونی سمجھنے لگے۔ شیخ معجونی نے ہلدی کی ایک گرہ کیا پائی کہ خود کو عطار سمجھ بیٹھے۔ بس شیخی اور نمود کی تصویر ہیں یہ لوگ۔ نہ بڑوں کا پاس نہ بزرگوں کا کچھ ادب میر تقی میر کو قنوطی اور غیر ترقی پسند شاعر کہتے ہیں اور اس پھکڑ باز، بے سُرے، یا وہ گو نظیر اکبر آبادی کو سب سے بڑا ترقی پسند شاعر بنا بیٹھے۔ حالانکہ حضرت شیفتہ نے اس کے بارے میں دو ٹوک فیصلہ دے دیا تھا کہ یارو وہ شاعر نہیں پھکڑ باز ہے۔

اللہ اللہ کیا زبان داں تھے وہ لوگ، امر گئے مگر زبان کی اینٹھن نہ گئی۔ کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی زبان، ہیروں جواہرات کی طرح جگمگاتی زبان۔ وہ زبان جو رگِ گُل سے

بُلبل کے پَر باندھتی تھی۔ وہ زبان جس کی شاعری کے ہزاروں بحر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ زبان جس کے دامن میں الفاظ کا بہت بڑا خزانہ چھپا ہوا تھا۔ وہی زبان آج لٹی ہاری نوچی کھسوٹی ژولیدہ زلفیں لئے یوں چوراہے پر کھڑی ہے۔ آج میر و غالب، مومن و سودا۔ انیس و دبیر۔ انشا و شیفتہ کی روحیں بہشت میں پریشان اور پشیمان پھر رہی ہونگی کہ ہائے ہائے —— یہ اردو کی کیا حالت ہو گئی؟

قلعہ معلّٰی اور قیصر باغ کے بعد اب دہلی۔ لکھنؤ اور حیدر آباد دکن بھی اُجڑ گئے۔ اب اُردو ہے اور پنجابی ہیں۔ پنجاب میں اُردو کو یوں روکھا سا دیکھ کر تو رہا ہی نہیں جاتا۔ طرفہ تماشہ تو یہ ہے کہ آج کل کے نام نہاد ادیبوں میں ننانوے فی صدی ادیب پنجابی ہیں۔ ایک ڈاکٹر اقبال صاحب کو چھوڑ کر کوئی ایک بھی سچ مچ کا ادیب دکھا دیجئے۔ سب کے سب مونڈھو ہیں مونڈھو۔ مگر صاحب پنجاب سے ایسے خوبصورت رسالے شائع ہوتے ہیں کہ کچھ نہ پوچھئے (پنجاب کے رسالے شاید حشرات الارض پر بھی بازی لے جاتے ہوں) پہلا صفحہ اُلٹ کر دیکھنے کے بعد اخی محترم حضرت وفا سندیلوی صاحب خلبہ و کعبہ اقبالہٗ مدظلہٗ اعلیٰ جنت مکانی کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے ؎

کہو اُردو کو چت کر دیں کہو اُردو کو پٹ کر دیں

زباں داں اور ہوں گے ہم تو پنجابی رسالے ہیں

لیکن کیا کیا جائے۔ اب تو ہمیں بھی پنجاب میں رہنے پر مجبور رہنا پڑا ہے۔ اور ہماری زبان بھی یہاں ٹھوکریں کھا رہی ہے اور اس پر سے یہ مرتے چوٹنے ترقی پسند ادیب۔

شاہانِ عالی مقام کی زبان کو مزدوروں اور کسانوں کی زبان بنانے والے بقول خود ادیب!
بس خدا ہی ان سے سمجھے۔

خیر حضور یہاں تک تو ٹھیک تھا کہ اُردو مزدوروں اور کسانوں کی زبان ہو گی مگر نیا شگوفہ ملاحظہ ہو کہ آج اُردو کے ان نام نہاد ادیبوں میں بڑے بڑے چوٹی کے ادیب ہندو اور سکھ ہیں۔ جانے اسلامی غیرت کو کیا ہو گیا کہ پریم چند۔ کرشن چندر۔ راجندر سنگھ بیدی اور رگھوپتی سہائے فراق کو بھی اُردو کے چوٹی کے ادیبوں میں شمار کیا جا رہا ہے۔ یہ تو کچھ قربِ قیامت کے آثار نظر آتے ہیں۔ ورنہ ہندو اور سکھ اُردو زبان کے ادیب اور چوٹی کے ادیب کہلائیں ۔۔۔ ہیہات وا ہیہات!!

خداوند عز و جل جس کی بحر و بر اور ارض و سما پر حکمرانی ہے۔ اس کا لاکھ لاکھ اور کروڑ کروڑ شکر ہے کہ پاکستان بنتے ہی اعلان فرما دیا گیا کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور اس طرح مسلمانوں کے نئے وطن پاکستان کی سرکاری زبان ہے۔ چلو یہ اچھا ہوا۔ ورنہ نیا جھگڑا شروع ہو جاتا۔ کیونکہ حال ہی میں ہندوستان کے ہندو اور سکھ ادیبوں نے ایک صحافتی بیان جاری فرما دیا کہ اردو زبان آدھی ہماری بھی ہے۔ اس بیان پر کوئی ساٹھ کے قریب ہندو اور سکھ ادیبوں نے بڑی ڈھٹائی سے اپنے اپنے دستخط ٹھونک دیئے تھے۔ اس بیان کی حمایت میں چند لادینے دہریئے، دل میں خدا کا خوف۔ نہ آنکھوں میں عاقبت کا ڈر۔ چند نام نہاد مسلمان ادیبوں نے بھی مضامین لکھ مارے۔ مضامین کیا لکھ مارے بس صفحے سیاہ کر ڈالے۔

توحضور اب آپ ہی فرمائیں اور از راہِ انصاف فرمائیں کہ اس ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ اُردو ہندوؤں اور سکھوں کی زبان ہے۔ جب کہ قبلہ و کعبہ محترم نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب نے ڈنکے کی چوٹ اعلان فرما دیا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اب لاکھ چیختے رہا کرو بیٹھے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ جب کہ چڑیاں چُگ گئیں کھیت۔

مگر ہم بچشمِ تحیر یہ دیکھتے ہیں کہ اسی پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان بن جانے کے بعد یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔ جس کے بنانے میں ان دونوں کا برابر برابر کا حصّہ ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت برج نرائن چکبست اور منشی پریم چند کا درجہ اردو ادب میں کسی طرح میرؔ۔ غالبؔ۔ حالیؔ اور اقبالؔ سے کم نہیں۔

معاذ اللہ! یہ ہم کیا سُن رہے ہیں؟ کہاں غالبؔ اور کہاں چکبست! کہاں حالیؔ اور کہاں رتن ناتھ سرشار۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان ترقی پسند ادیبوں نے ذرّے کو آفتاب کے مقابلے میں آفتاب کو ستارے کے مقابلے میں پیش کرنے کی مضحکہ خیز قسم کھا رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے ترقی پسند ادیب ہندوستان کے ایجنٹ ہیں

ان خرابوں کے خراب ترقی پسند ادیبوں کو غالباً ہندوستان یا روس سے پیسہ بھی بطور رشوت ملتا ہے۔ کیونکہ وُہ آج بھی مخالف پاکستانی باتیں کرتے نظر آتے ہیں کہ تقسیمِ ہند اپنی

تہذیب و تمدن اور بالخصوص اردو زبان کو تقسیم نہیں کر سکتا۔ اب ان لوگوں کو کیا کہا جائے۔ کھائیں گے پاکستان کا اور گُن گائیں گے ہندوستان کا۔ یا روس کا۔ اے واہ!!

اب ذرا حکومت نے ادیبوں اور شاعروں کے پیچھے خفیہ پولس لگا دی تو بس ایک بیان دے مارا کہ حکومت ادیبوں اور شاعروں پر ظلم کر رہی ہے۔ بھلا بتائیے یہ ادیب اور شاعر ملک کے مزدوروں اور کسانوں میں اُردو زبان پھیلانے کے لئے جاگیردار اور سرمایہ داروں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کم بختوں خفتہ نصیبوں کو کیا معلوم کہ جاگیردار اور سرمایہ دار تو پاکستان کی رونق ہیں۔ یہ نہ ہوں تو ہزاروں مزدور اور کسان زندہ رہ جائیں۔ مزدوروں اور کسانوں کا کیا ہے۔ وہ نیچ لوگ انسان تھوڑے ہی ہیں۔ وہ تو کیڑے مکوڑے ہیں۔ ان کا مر جانا ہی اچھا ہے، چہ جائیکہ وہ اُردو بولتے ہوئے زندہ رہیں۔ اردو عامیوں کی زبان نہیں بلکہ نوابوں اور جاگیرداروں کی زبان ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

اُردو کے جو ادیب جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے وجود کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ وہ دراصل پاکستان کے دشمن ہیں اور پاکستان کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ پاکستان ایک مالدار ملک ہے۔ وہ فقیروں اور بھکاریوں کا ملک نہیں ہو سکتا۔ بھلا یہ بھی کوئی بھلمنسائی ہے کہ ایک اچھے خاصے اشراف انسانوں کے ملک میں مزدوروں اور کسانوں اور اسی طرح کے عام لوگوں کی حکومت قائم ہو۔ اگر پاکستان میں مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم ہو گئی تو پاکستان، انگلستان اور امریکہ جیسے ٹکسالی اشراف ممالک کو کیا منہ دکھا سکے گا کہ یہاں مزدور اور کسان راج کرتے ہیں اور جاگیردار اور سرمایہ دار بھوکے مرتے

ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ آپ کے اناج کی بوری اٹھانے والا مزدور راہ چلتے چلتے اُچک کر وزیرِ اعظم کی کرسی پر جا بیٹھے اور کھیت میں ہل چلانے والا کسان اپنے بیل ہانکتا گورنر جنرل کے محل میں داخل ہو اور گورنر جنرل کے تخت پر ننگے بدن متمکن ہو جائے۔

ایسا ہوگا تو پھر "اشرافیہ" میں پاکستان کا سر شرم سے جھک جائے گا اور پاکستان کی عزت ایک ڈالر تو کیا دو کوڑی کی بھی نہیں رہے گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو کی آبادکاری اور بحالی کے لیئے ہم "مسلمان پاکستانیوں" یا پاکستانی مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے۔

یہ سوال آج کل بہت پوچھا جا رہا ہے۔ بہت سوچا جا رہا ہے۔ بہت معرضِ بحث میں آ رہا ہے۔ چونکہ یہ سوال بہت اہم ہے اور جیسا کہ معمولی سوال بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہم نے اس سوال کی اہمیت کے تدِ نظر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ یہاں مملکتِ خداداد میں جو بھی ادیب ہے وہ پاکستان کی حکومت یعنی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی حکومت کا وفادار رہے گا۔ وہ اپنے ذہن و قلم کی تمام تر توانیں پاکستان میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کی بقا کے لیئے استعمال کرے گا۔ اسے پاکستان کی محنت کش آبادی سے قطعاً کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ ضروری ہے کہ ہم ادیب اور شاعر دیانت داری سے یہ فیصلہ کر لیں کہ سرمایہ دار کے وجود سے مزدوروں کا وجود اور جاگیرداروں کے وجود سے کسانوں کا وجود قائم ہے۔ اس لیئے ہم ادیب یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم پاکستانی حکمرانوں کے ادیب ہیں عوام کے ادیب نہیں۔ کیونکہ اردو قلعہ معلیٰ کی زبان ہے۔ بادشاہوں اور شاہزادیوں

زبان ہے۔ اُردو اشرافوں، امرا اور جاگیرداروں کی زبان ہے۔ اس لئے ہم حکومت کے وفادار ہیں۔ عوام کے وفادار نہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے سامنے دُنیا کے سارے بڑے ادیب مثلاً آندرے ژید۔ بوڈلیر۔ سامرسٹ ماہم۔ مارشل پروست وغیرہ وغیرہ کی مثالیں بھی رکھی ہوئی ہیں۔

اس سلسلہ میں ہم پاکستان کے وفادار ادیبوں نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ ایک اُردو کی انجمن اور ایک اُردو کی دوکان قائم کی جائے۔

اردو کی انجمن تو قائم ہو چکی ہے اور ماشاءاللہ برابر کام کئے جا رہی ہے۔ البتہ اردو کی دوکان کل بروز بدھ وار ہم نے موچی دروازہ لاہور میں ہمارے مہربان وزیر ادبیات کی دستگیری میں قائم کی ہے جس کا افتتاح مشہور و معروف دیباچہ خواں ڈاکٹر شہ زور صاحب نے فرمایا ہے۔ حاضرین میں پاکستان کے سارے مشہور و معروف ادیب اور شاعر اور ان کی بیویاں اور ان کے بچے بھی شریک تھے۔

یہ ہماری دوکان ایک لمیٹڈ کمپنی ہے۔ جس میں بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے رقمی حصوں کے علاوہ محنت بھی شامل ہے۔ ہمارا مسلک اور نصب العین یہ ہے کہ:۔

۱۔ ہم ادب برائے ادب کے قائل ہیں۔

۲۔ ہم جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ حکومت کے ہم نوا ہیں

۳۔ ہم انسان کی سماجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی زندگی سے متعلق مسٹرا لبا متعفن ادب نہیں پیش کریں گے۔ بلکہ ہمارے پیش نظر انسان کی صرف جنسی اور نفسانی زندگی ہے

کیونکہ جنس مرکزِ حیاتِ انسانی ہے۔

۴۔ ہمارا اعلان ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور اُردو کا وطن صرف پاکستان ہے۔

ہم ہیں آپ کے شہر کے بہترین مضمون تیار کرنے والے
گلزار سند بلوی اینڈ کو

۱۔ ہماری فرم میں ہر قسم کے علمی، ادبی، غیر سیاسی، غیر معاشی، تاریخی، جنسی، جغرافیائی، نباتاتی، حیاتیاتی، کیمیاتی، طبیعاتی، ریاضیاتی مضامین تیار ہوتے ہیں

۲۔ ایک بار آرڈر دیئے ہوئے مضامین کا آرڈر کسی طرح بھی منسوخ نہیں ہو سکتا۔

۳۔ ہر مضمون کے آرڈر کے ساتھ مبلغ پانچ روپیہ بیعانہ داخل کرنا ضروری ہے۔

۴۔ تیاریٔ مضمون کے دوران میں اگر فریقین میں کوئی جھگڑا ہو تو یہ جھگڑا لاہور کورٹ میں طے ہوگا اور مجسٹریٹ کا حکم آخری حکم ہوگا۔

۵۔ ہماری فرم وعدہ کی بڑی پابند ہے۔ مگر ہر سال کے آغاز میں چونکہ ہر رسالہ کا سالنامہ شائع ہوتا ہے۔ اس لئے ان دنوں تاخیر ہمارے بس کی بات نہیں ہوگی۔ سالناموں کی اشاعت کے دوران میں ہماری فرم میں بہت کام ہوتا ہے۔

۶۔ ہر مضمون کے دام مقرر ہیں البتہ سیلز ٹیکس علیحدہ۔

۷۔ شادیوں کے موقعہ پر ہماری فرم میں اعلیٰ سے اعلیٰ کوالیٹی کے سہرے بھی تیار کئے جاتے ہیں۔

۸۔ اگر راز و نیاز کے افسانے لکھوانا ہو تو ہمارے پاس پردہ کا بھی معقول انتظام ہے

۹۔ ساری خط و کتابت خفیہ رکھی جائے گی۔

۱۰۔ بچوں کے لئے مضامین آدھی قیمت پر لکھے جائیں گے اور ہر بدھوار کو مفت مضامین لکھے جائیں گے۔ ہماری خدمات حاصل کیجئے۔

گلزار سندیلوی اینڈ کو

جنرل مرچنٹ۔ اردو ادب۔ موچی دروازہ۔ لاہور

فون نمبر ۹۹۹۹۔ تار کا پتہ :۔ "سندیلکیو"

ع پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

لاہور کی سڑکیں

(ایک بے مغز غیر تحقیقی مقالہ جو آل پاکستان سڑک کانفرنس کے افتتاحی جلسے بمقام
جھنگ مگھیانہ میں پڑھا گیا اور بے حد ناپسند کیا گیا)

خواتین حضرات اور بچے!
پہلے تو آپ میرا شکریہ ادا کیجیے کہ آپ نے خود کو اس لائق سمجھا کہ آپ میرا مقالہ سن سکیں اگر سن
نہ سکیں تو سمجھ سکیں اگر سمجھ سکیں تو دوسروں کو سمجھا سکیں۔ اس لئے میں بھی اپنی عزت
اور آپ کی حوصلہ افزائی کی خاطر یہاں آنے پر رضامند ہوا ہوں۔ ورنہ بقول ایک
فارسی شاعر شما آیند کہ شما دانید۔
اس مفصّل تمہید کے بعد آپ اصل موضوع کی طرف تشریف لائیے۔ آپ کے

مقالے کا عنوان ـــــ ذرا ایک لمحے کے لئے ٹھہریئے۔ مقالہ در اصل میرا ہے۔ لیکن اب آپ میں اور مجھ میں کوئی تکلف نہیں رہا۔ اس لئے آپس میں "میرے تیرے" کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ آپ کی چیز میری چیز ہے اور میری چیز . . . ہی ہی ہی ہی۔ اسی لئے میں کہہ رہا تھا کہ آپ کے مقالے کا عنوان ہے ـــــ لاہور کی سڑکیں ـــــ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے مجھے اصولاً آپ کو یہ بتانا ہے کہ لاہور کی سڑکیں تعمیراتی نقطۂ نگاہ سے کیسی ہیں؟ یہ تاریخ کے کس دور میں اور کس بادشاہ نے بنائی ہیں (ہمارے اپنے زمانے میں بادشاہ بہت سڑکیں بناتے تھے۔ ساری تاریخ ہندوستان میں بادشاہ اور سڑکیں برابر برابر کی تعداد میں موجود ہیں) لاہور پہلے بنا ہے یا سڑکیں پہلے بنی ہیں؟ اگر لاہور پہلے بنا تو سڑکیں کہاں تھیں؟ اگر سڑکیں پہلے بنیں تو لاہور کہاں تھا؟ لاہور میں کتنی سڑکیں سیمنٹ تارکول یا اینٹوں سے بنائی گئی ہیں؟ آیا لاہور میں کوئی سڑک ایسی بھی ہے جسے نہ تو کسی بادشاہ نے بنایا ہو نہ کسی مزدور نے بلکہ وہ آپ ہی آپ اپنی مرضی سے خود ہی بن گئی ہو اور زبردستی سڑک کہلانے لگی ہو؟

(قہقہے)

مثلاً نیلا گنبد سے بڑے ڈاک خانے کو جانے والی سڑک۔ اگر یہ نہ ہوتی تو لوگ انڈیا ہاؤس کی طرف سے مال روڈ جا سکتے تھے اور اسی طرف سے نیلا گنبد آ سکتے تھے۔

(مسکراہٹیں)

مگر اُوپر بیان کیئے ہوئے سوالات کا نیچے جواب دیا جانا اس لیئے ضروری نہیں ہے کہ یہ سوالات محض بنیادی سوالات ہیں اور بنیاد سے ہم ترقی یافتہ انسانوں کا کوئی راست یا بالراست تعلق ہمارے رجعت پسند ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ ہم ہرگز رجعت پسند نہیں ہیں۔ ... اور ثبوت کی خاطر ہر شخص ایک ثبوت پیش کر سکتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی مکان میں رہتا ہے۔ اگر میں اس سے یہ سوال کروں کہ میرے بھائی میرے ہمدم میرے دوست! بھلا بتاؤ تو تم جس مکان میں رہتے ہو تم نے اس کی بنیاد کے بارے میں بھی کبھی سوچا ہے ـــــ اس سوال کا جواب یہاں وہاں ہر جگہ ہر شہر اور ہر ملک میں صرف نفی میں ملے گا۔ یہ ہماری روزمرہ زندگی کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہم میں سے ہر مکین اپنے مکان کی دیواروں کی مرمت یا سفیدی کے بارے میں تو سال میں دو تین بار سوچتا ہے۔ برسات میں ٹپکنے والی چھت کو ٹھیک کراتا ہے۔ گھر کے ہر فرش پر روزانہ جھاڑو دیتا ہے یا نوکر چاکر سے جھاڑو دلواتا ہے۔ مکان اگر ایک منزلہ ہو تو دو منزلہ۔ دو منزلہ ہو تو تین منزلہ بنانے کی فکر کرتا ہے مگر نہیں مگر کرتا اور نہیں سوچتا تو اپنے مکان کی بنیاد کے بارے میں نہیں سوچتا ـــــ میری اس مثال سے آپ نہیں تو کم از کم میں مطمئن ضرور ہو گیا ہوں۔ کہ اس عالمِ فانی میں بنیاد یا بنیادی باتیں یا بنیادی سوالات سب کے سب محض بے بنیادی چیزیں ہیں۔

(تالیاں)

اس وضاحت کے بعد مجھے یقین ہے کہ آپ یہ نہیں سوچ رہے ہوں گے کہ اگر یہ

نہیں تو پھر میں آپ کو لاہور کی سڑکوں کی بابت کیا بتانے آیا ہوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف میں ماہر نرالیات ہوں بلکہ لاہور کی سڑکیں خود بھی ساری دُنیا جہاں کی سڑکوں سے نرالی ہیں اور اس لیے ساری دُنیا جہاں کی سڑکوں سے نرالی ہیں اور اس لئے ساری دُنیا جہان کی سڑکوں میں مجھے صرف لاہور کی سڑکیں پسند ہیں۔ سڑکیں یوں تو ہر شہر میں ہوتی ہیں صرف لاہور ہی کا کیا ذکر — کراچی، دہلی، لندن، نیو یارک، ماسکو اور ہر بڑے چھوٹے شہر اور گاؤں میں سڑکیں ہوتی ہیں۔ سوائے ایک "شہر خموشاں" کے اور کوئی شہر اس کرۂ ارض پر نہیں جو بے سڑک ہو یا کوئی سڑک ایسی نہیں جو "غریب شہر" ہو مگر صاحب جو بات سڑکوں میں ہے وہ کہیں نہیں۔ بقول کسی یا وہ گو کے سڑکوں میں سڑک تو لاہور کی سڑک —!

میں لاہور کی سڑکوں پر صبح ۱۰ بجے سے رات کے ۲ بجے تک بڑے محققانہ انداز میں گھوما کرتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میں کوئی بیرونی یا مقامی مہاجر ہوں اور نہ اس لئے کہ محکمہ آبادکاری نے "ری الاٹمنٹ" میں مجھے گھر سے بے دخل کیا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور ایسی نوبت مجھ پر آبھی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ میں رشوت دینے اور سفارشیں چلانے میں بڑا ماہر ہوں۔ میں لاہور کی سڑکوں پر تو اسی لئے گھوما کرتا ہوں کہ یہ گھومنے کے لئے ہی بنائی گئی ہیں۔ یعنی بقول شاعر

"ہے گھومنے کی چیز یہ تو بار بار گھوم"

لاہور کی سڑکوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان پر گہما گہمی ہوتی ہے۔ ان پر اتنی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے اور از صبح تا شام تا اتنی آباد رہتی ہے کہ کوئی اجنبی یہ رائے نہ قائم کرے کہ

یہاں سڑکیں آباد اور گھر برباد ہیں۔ لاہور والوں کو سڑکوں سے عشق ہے۔ یہ دن بھر سڑکوں پر گھومتے چلتے پھرتے بیٹھتے اُٹھتے ہیں اور رات کو گھروں سے چارپائیاں نکالکر سڑکوں پر سو جاتے ہیں۔ رات میں دس بجے کے بعد آپ گوالمنڈی۔ موچی دروازہ۔ مصری شاہ، سنت نگر کسی سڑک پر چلے جائیے۔ آپ کو دو رویہ چارپائیاں ہی چارپائیاں نظر آئیں گی اور آپ بڑے عبرتناک انداز میں کہہ اُٹھیں گے کہ ہاں —— یہی ہیں وہ لوگ جو دن بھر ان سڑکوں پر چلتے پھرتے رہے اور اب دیکھو۔ انہیں کہ یہ اسی پر سو رہے ہیں —— بے چارے !! (عبرت عبرت)

بعض محققین عرصے سے ایک اور بات کی تحقیق کر رہے ہیں کہ لاہور کی سڑکیں دن میں چلنے پھرنے اور رات کو سونے کے لئے بنائی گئی ہیں یا ٹکریں لینے کے لئے۔ —— ان بعض میں سے چند محققین کی رپورٹ یہ ہے کہ لاہور کی سڑکوں پر چلنا پھرنا کم ہوتا ہے ٹکریں زیادہ ہوتی ہیں۔ آدمی کی آدمی سے ٹکر تو خیر ہوا ہی کرتی ہے مگر آدمی کی سائیکل سے یا سائیکل کی تانگے سے یا تانگے کی لاری سے یا لاری کی اومنی بس سے یا اومنی بس کی کار سے یا کار کی بیکار سے ٹکریں بے شمار ہوتی ہیں اور اس لئے ہوتی ہیں کہ لاہور کا میو ہسپتال بہت بڑا ہسپتال ہے۔ اتنا بڑا ہسپتال کہ سارے ہندوستان اور پاکستان میں ایک دو ہسپتال اس کا مقابلہ کر سکیں ہسپتال کا بڑا ہونا کوئی اہم خصوصیت نہیں ہسپتال کا سدا آباد رہنا اہم خصوصیت ہے اور میو ہسپتال کی آبادکاری میں لاہور کی سڑکوں کا قابلِ ستائش حصّہ ہے

حضرات اور صرف حضرات! لاہور کی سڑکوں پر ٹکریں اس لئے زیادہ ہوتی ہیں کہ یہاں کے لوگ بڑے صحت مند اور کسرت اور ورزش کے عادی ہوتے ہیں۔ صبح سویرے ڈنٹر پیل کر دودھ اور لسی پی کر گھر سے نکل جاتے ہیں اور سڑکوں پر ٹکریں لیتے پھرتے ہیں تاکہ جسم ذرا ہلکا ہو لے۔۔۔ بالعموم پہلے سائیکلوں کی ٹکر ہوتی ہے۔ اس کے بعد سائیکل والوں کی ٹکر جو اوّل الذکر سے زیادہ دیرپا، پائیدار اور نتیجہ خیز ہوتی ہے اور مجھ جیسے تماش بین حضرات کے لئے بڑی لطف انگیز ہوتی ہے۔

لاہور کی سڑکوں پر سائیکل راں حضرات کا بہت بڑا حق ہے۔ لاہور میں جتنی سائیکلیں ہیں۔ ان کی دوچند تعداد سائیکل سواروں کی ہے۔ میں نے دوچند اس لئے کہا کہ لاہور میں تنہا سائیکل کی سواری کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ سائیکل پر کم از کم دو آدمیوں کا سوار ہونا آدابِ سڑک میں داخل ہے۔ ویسے زیادہ سے زیادہ پانچ پانچ آدمی بھی ایک ہی سائیکل پر سوار آپ کو لاہور کی کسی سڑک پر بھی نظر آ سکتے ہیں۔ لوگ سیٹ ڈنڈے اور کیریر کے علاوہ ہینڈل پر بھی بیٹھتے اور پچھلے مڈگارڈ پر بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔

لاہور کی سڑکوں پر "مست خرامی" بھی بے حد معیوب قرار دی گئی ہے۔ اس لئے لوگ سائیکلیں اتنی تیز چلاتے ہیں کہ چلانے والے کو گھنٹی بجانے کے بجائے حلق پھاڑ پھاڑ کر آواز دینی پڑتی ہے۔ بچ ـــ بچ جا ـــ!! آپ جب بچ جاتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں کہ وہ سائیکل کہاں گئی جو ابھی ابھی آپ سے بچ کر یا آپ سے پہلو بچا کر نکل گئی ہے۔

لاہور کی سڑکوں پر چلنے پھرنے کے لئے ڈاکٹروں اور اطبا کی یہ رائے ہے کہ وہی شخص لاہور کی سڑکوں پر چل پھر سکتا ہے۔ جس کا نروس سسٹم یا اعصابی نظام خراب ہو۔ یا جس کو اختلاج قلب کا پرانا مرض ہو۔ وُہ نہ صرف ان امراض سے شفا پا جائے گا۔ بلکہ دُنیا جہان سے بھی نجات پا جائے گا۔

خواتین اور صرف خواتین! لاہور کی سڑکوں پر جو سائیکلیں چلتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ انہیں کوئی مرد یا عورت ہی چلائے۔ بلکہ بعض اوقات سائیکل پر نہ مرد سوار ہوتا ہے نہ عورت مگر سائیکل برابر چلتی ہے۔ کل ہی میں نے چیرنگ کراس پر ایک عجیب منظر دیکھا کہ لارنس روڈ کی طرف سے ایک سائیکل بڑے زور کی آ رہی تھی۔ جس پر بظاہر کوئی مرد یا عورت سوار نہیں تھی۔ بلکہ ایک کالا برقع سوار تھا ـــــ میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ سارے ہندوستان اور پاکستان میں لاہور ہی وُہ واحد شہر ہے۔ جہاں کی سڑکوں پر ایک برقع بھی سائیکل چلا سکتا ہے۔

لاہور کی سڑکیں جب سے "ماڈرنائیز" ہوئی ہیں۔ برقع کا سائیکل سے گہرا تعلق ہو گیا ہے اگر کبھی برقع خود سائیکل نہ چلائے تو سائیکل کے ڈنڈے یا کیریر پر ضرور دھرا ہوتا ہے آپ اسے اپنی بیوی کہہ لیجیئے یا کچھ اور ـــــ دیکھنے میں تو وُہ برقع ہی ہے اور برقعہ ہی کہا جائے گا۔

لاہور کی سڑکوں پر عورتیں کم اور برقعے زیادہ ہوتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر میرے ایک امریکن دوست نے مجھ سے پُوچھا تھا ـــــ یہ کس قسم کے انسان ہیں؟ اور یہ کس

ملک کے باشندے ہیں؟ ان کا چہرہ مہرہ، ہاتھ پاؤں جسم کہاں ہے؟ میں اسے اس وقت خاطر خواہ جواب نہ دے سکا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ جا کر اس نے وہاں کے اخبار "لائف" میں ایک مضمون لکھا کہ پاکستان میں تین فرقے بستے ہیں۔

(۱) مسلمان

(۲) ہندو

(۳) بُرقعہ

برسبیل تذکرہ یہاں ایک غیر ضروری بات کا ذکر کرنا بے حد ضروری ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پاکستان میں ہندوؤں کے اقلیت میں آ جانے کے باعث فرقہ دارانہ فسادات کا اندیشہ معدوم ہو گیا ہے مگر میرا جہاں تک خیال ہے۔ یہ اندیشہ معدوم نہیں ہوا۔ بلکہ اور زیادہ شدید ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت بھی "برقع مسلم فساد" چھڑ جائے۔ اکّی دُکّی وارداتیں نو روز ہوتی ہی رہتی ہیں۔ چنانچہ دو تین روز قبل رتن چند روڈ پر ایسا ایک فساد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ایک نوجوان مسلمان نے ایک بُرقعے کے ساتھ جانے کیا سلوک کیا کہ برقعے نے بیچ سڑک اپنا سینڈل اُتار کر اس نوجوان کی خوب مرمت کی۔ (شرم شرم)

لاہور کی سڑکوں پر ایسی اکّی دُکّی وارداتیں روز ہوتی رہتی ہیں اور اس خطرے کا شدید اندیشہ لاحق ہو گیا ہے کہ کسی دن دونوں فرقوں میں باضابطہ منظّم فساد ہو جائے بہر حال اور فی الحال لاہور کی سڑکیں اس وقت بڑی دلچسپ منظر کی حامل ہوتی ہیں

جب کوئی برقعہ اپنا صبر و شکیب کھو بیٹھتا ہے۔

لاہور کی سڑکوں پر بالعموم جو نوجوان چلتے پھرتے ہیں۔ ان کے چلنے پھرنے کے مقصد کو انگریزی میں برقع ہٹنگ (BURQA HITTING) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ حکومت اور قومی لیڈر اور صحافت سڑکوں پر برقع ہٹنگ کے خلاف کوئی موثر اقدام کرنے والے ہیں ــــ یہاں لاہور کے "سڑکیلے نوجوانوں" کو میرا ابھی ایک بے خلوص مشورہ ہے کہ بھائیو برقعے کو محض برقعہ نہ سمجھو بلکہ ماں بہن سمجھو۔ تاکہ لاہور کی سڑکوں کی مخصوص شرافت پر کوئی بدنما دھبہ یعنی لیڈیز سینڈل نظر نہ آئے۔

حضرات ــــ! ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے لاہور کی سڑکوں کی برق رفتاری کا ذکر کیا تھا مگر تانگے کو بھول گیا تھا۔ تانگہ تو لاہور کی سڑک کی روح ہے۔ ایک بیقرار روح جو ہر دم تیز تیز دوڑتی پھرتی ہے۔ لاہور میں تانگہ ہی وہ سواری ہے جس نے اس کی سڑکوں کو برق رفتاری کی صفت سے ممیز کیا ہے۔ میں نے جب سے لاہور کی سڑکیں دیکھی ہیں۔ اس دن سے میری ایک آرزو ہے کہ میں کسی مست خرام یا آہستہ خرام تانگے کو دیکھوں مگر میری یہ آرزو آج تک پوری نہ ہو سکی۔ لاہور میں تانگہ کس طرف سے آتا ہے۔ کدھر جاتا ہے۔ آج تک مجھے معلوم نہ ہو سکا۔

ایک بار کسی جگہ سے تانگہ روانہ ہوتا ہے تو بس پھر کچھ نہ پوچھیے۔ کتنی ہی گھنی ٹریفک اور بھیڑ بھاڑ کیوں نہ ہو۔ تانگہ اور اس کا گھوڑا اور تانگہ والا اور تانگے

میں بیٹھی ہوئی سواریاں سب ہوا سے باتیں کرتے اُڑے جاتے ہیں۔ تانگے والا مسلسل آوازیں لگاتا رہتا ہے۔

بچ موٹر توں

بچ جا جوان

بچ جا اوئے سائیکل جوانا

بچ جاؤ بزرگو

بچ جا مائی

بچ جا کاکی

لیکن مجال ہے ان میں سے کوئی ایک بھی بچ کر نکل جائے۔ تانگہ والا بھلا کسی کو بچ کر نکلنے بھی دے۔

حضرات! میں لاہور کے تانگوں سے مطلق نہیں گھبراتا۔ اس لئے ہمیشہ فٹ پاتھ پر چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ لاہور کی بیشتر سڑکوں کے فٹ پاتھ سرے سے غائب ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ لاہور کی ہر سڑک بجائے خود فٹ پاتھ ہوتی ہے۔ یہاں لوگ فٹ پاتھ پر چل کر اپنی توہین کے مرتکب ہونا گوارا نہیں کرتے اور ہے بھی سچ بات کہ جو شخص دندناتا ہوا سڑک پر چل سکتا ہے۔ وہ بھلا فٹ پاتھ پر کیوں چلے؟ —— لاہور کے لوگوں کی اس غیرت مندی سے مہاجرین نے بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔ اُنھوں نے فٹ پاتھوں پر قبضہ کر لیا ہے اور وہاں دن بھر

میووں اور آئیس کریم کی گاڑیاں کھڑی کرتے ہیں۔ پان سگریٹ کے خوانچے لگائے بیٹھتے ہیں۔ آلو چھولے اور دہی بڑے بیچتے ہیں سیخ کباب اور کلیجی بھونتے ہیں اور برملا فروخت کرتے ہیں۔ کٹ پیس کپڑوں پرانے جوتوں کی دکانیں سنسنی خیز ناولوں اور فلمی گانوں کی کتابوں کے سٹال لگائے بیٹھتے ہیں۔ انہیں فٹ پاتھوں پر کہیں کہیں کوئی فوٹو گرافر بھی معہ اپنے سٹینڈ پر استادہ کیمرے کے نظر آتا ہے جو "آناً فاناً" میں تصویر کھینچتا ہے اور پوزیٹیو پرنٹ کو پانی کے لوٹے میں بھگو کر اور پھر سکھا کر آپ کی تصویر آپ کے حوالے کر دیتا ہے اور آپ غالب کا یہ مصرع پڑھتے ہیں۔ ع

"تکلف برطرف مجھ سے میری تصویر بہتر ہے

انہی فٹ پاتھوں پر کوئی قسمت کا حال بتانے والا زائچہ لئے بیٹھا ہے۔ انہی فٹ پاتھوں پر کہیں کوئی فٹ پاتھ کا ڈاکٹر ناظرین کو جمع کرتا ہے۔ پہلے سانپ اور نیولے کی لڑائی دکھاتا ہے۔ تاش کے پتوں کو پھینٹتا ہے۔ آپ کی آنکھوں میں "سرمہ بصیرت" لگا کر آپ کو جلاب کی گولیاں کھلاتا ہے اور جان صاحب اور چرکین کے اشعار سے آپ کو محظوظ کر کے خود بھی محظوظ ہوتا ہے۔ رات کے وقت ان فٹ پاتھوں پر کچھ لوگ سو جاتے ہیں اور کچھ بیٹھے بلبل ترنگ بجاتے ہیں۔ ہز ماسٹرز وائس کے گراموفون پر مس گوہر کے ریکارڈ سنتے ہیں۔ "مورے جوبنا کا دیکھو ابھار" جن صاحبانِ استطاعت کو گراموفون میسر نہیں۔ وہ بیٹھ کر قوالی شروع کر دیتے ہیں۔ وصل کی شب ہے ظالم گھڑی بھر کے لئے آجا۔

فٹ پاتھوں کے اس جائز استعمال کے بعد فٹ پاتھ اب فٹ پاتھ نہ رہے بلکہ "ہومیو پاتھ" ہو کر رہ گئے۔ یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ڈاکٹری علاج نے ہومیوپیتھک علاج کو غائب کر دیا ہے۔ بالکل اسی طرح زندہ دلانِ لاہور نے سڑکوں سے فٹ پاتھ کو غائب کر دیا ہے۔

کوئی نو وارد اور اجنبی لاہور کی سڑک پر آ کر سب سے پہلے یہی سوچتا ہے کہ الٰہی اس شہر کی سڑکوں کے فٹ پاتھ کہاں ہیں؟ مگر حضرات میں نے تو بڑی تحقیق کے بعد بالآخر پتہ چلا لیا کہ ان سڑکوں کے فٹ پاتھ کہاں ہیں؟ لاہور کے محکمہ آرائش نے ساری سڑکوں کے فٹ پاتھ ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں۔ اگر آپ کو سچ مچ فٹ پاتھ کی تلاش ہو تو آپ موچی دروازہ یا دہلی دروازہ کے اندر چلے جایئے۔ آپ کو لاہور کی ساری سڑکوں کے فٹ پاتھ ایک ہی جگہ مل جائیں گے۔ موچی دروازہ سے محلہ چابک سواراں جایئے یا دہلی دروازہ سے سنہری مسجد آپ کو سڑک کہیں نہیں ملے گی۔ صرف فٹ پاتھ ملیں گے۔ اب پھر موچی دروازے یا دہلی دروازے سے باہر نکل آیئے تو آپ کو سڑکیں ہی سڑکیں ملیں گی۔ فٹ پاتھ کہیں نہیں ملے گا۔ لاہور کے محکمۂ تعمیرات و آرائش نے یہ بڑا اچھا کیا ہے کہ سڑکیں ایک طرف کر دیں اور فٹ پاتھ ایک طرف جمع کر دیئے۔ کیونکہ لاہور کے باشندے "آداب استعمال سڑک" کا کچھ ایسا لحاظ کرتے ہیں کہ فٹ پاتھ اور سڑک میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا اور وقت ضرورت یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ سڑک کونسی ہے اور فٹ پاتھ کونسا۔ ہر دو کی بہ آسانی دستیابی کی خاطر لاہور کے محکمۂ آرائش اس حسنِ انتظام کے لیے

لائق ستائش ہے۔

(آفرین آفرین کے نعرے)

حضرات خواتین اور بچے! لاہور پاکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ میری اس اطلاع پر آپ ضرور یہ نہیں سوچ رہے ہوں گے کہ پھر تو لاہور کی ساری سڑکیں بھی پاکستانی ہوں گی اور مسلمان ہوں گی! مگر ایسا نہیں ہے۔ زیادہ تر سڑکیں انگریز ہیں۔ مثلاً میکلوڈ روڈ، بیڈن روڈ، ایبٹ روڈ، نکلسن روڈ، ایمپرس روڈ، ڈیورنڈ روڈ، منٹگمری روڈ، برانڈرتھ روڈ، لارنس روڈ، میو روڈ ــــ لیکن یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ جس طرح گورنر مغربی پنجاب سر فرانسس موڈی، گورنر صوبہ سرحد سر ڈنڈاس اور افواجِ پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل ڈگلس گریسی انگریز ہوتے ہوئے بھی پاکستانی ہیں۔ بالکل اسی طرح میکلوڈ روڈ اور دوسری کئی انگریز روڈ انگریز ہوتے ہوئے بھی پاکستانی رہ سکتی ہیں مگر تازہ ترین اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ بعض سڑکیں اپنے آپ کو مکمل طور پر پاکستانی بنا رہی ہیں۔ مثلاً حال ہی میں میو روڈ مشرف بہ اسلام ہو کر اقبال روڈ ہو گئی ہے اسی طرح ہو سکتا ہے کہ کسی دن "بیڈن روڈ" بھی "بادین روڈ" بن جائے لاہور والوں کو اپنی سڑکوں سے قطعاً مایوس نہ ہونا چاہیئے۔

پاکستان بن جانے کے بعد سے سینکڑوں ہندو لاہور سے ہندوستان چلے گئے۔ مگر پاکستان کی رواداد حکومت نے انہیں نہیں تو کم از کم ان کی سڑکوں کو پورے پورے اقلیتی حقوق عطا کئے ہیں۔ مثلاً کرشن نگر، سنت نگر، رام نگر، رتن چند روڈ، گوجر سنگھ روڈ

وغیرہ کو پُوری پُوری آزادی حاصل ہے۔ حکومت ان کے اندرونی معاملات یعنی صفائی مرمّت وغیرہ میں اس لئے مداخلت نہیں کرتی کہ اس سے حکومت کی مذہبی رواداری پر حرف آنے کا امکان ہے۔

(نعرے پاکستان زندہ باد)

خواتین، حضرات اور بچّے ۔۔۔ پاکستان میں جتنی سیاسی جماعتیں ہیں۔ ان کا اثر پاکستانی سڑکوں پر بھی پڑا ہے۔ مثلاً انار کلی، پیسہ اخبار سٹریٹ، موچی دروازہ، کشمیری بازار خواجہ دل محمد روڈ، یہ ساری سڑکیں ٹھیٹ مسلم لیگی ہیں میکلوڈ روڈ کے چوراہے سے آگے جو سڑک جاتی ہے۔ جہاں آغا شورش کاشمیری کا ہوٹل وریا ہوٹل ہے اور جو اب مشرف بہ اسلام ہوکر شبستان ہوٹل بن گیا ہے، وُہ سڑک احراری ہے۔ میو روڈ سے گڑھی شاہو تک جتنی سڑکیں جاتی ہیں۔ وُہ ساری سڑکیں کمیونسٹ ۔۔۔ یعنی لال سڑکیں بعض مفکّرین کا خیال ہے کہ پاکستان میں اگر انقلاب آئے گا تو وُہ گڑھی شاہو کی کمیونسٹ سڑکوں کی طرف سے ہی آئے گا۔ بقول شاعر یا بقول مصرع۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!!

حضرات! میرے چند دشمنوں اور آپ کے دوستوں کا یہ بھی خیال ہے کہ پاکستان میں بیشتر سڑکیں لال سڑکیں ہیں یعنی سُرخ سُرخ اینٹوں کے فرش سے پاٹی ہوئی سڑکیں جو بہت غریب ہیں اور بہت زیادہ ہیں۔ دہلی دروازے اور موچی دروازے کے اندر جتنی سڑکیں ہیں، وُہ سب کی سب سُرخ ہیں ۔۔۔ مگر میں ان کے بارے میں اس سے

زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ان سڑکوں کے ذاتی افلاس کے باعث ابھی ان کی کوئی سیاسی یا سماجی حیثیت متعین نہیں ہوئی۔ انہیں نہ سڑک تسلیم کیا جاتا ہے نہ فٹ پاتھ۔ اور یہ ایک حد تک سچ بھی ہے۔ برسات کے زمانے میں یہ سڑکیں، نہریں اور نالے بن جاتے ہیں اور گرمی سردی میں کوڑے کرکٹ کے لمبے لمبے گھوڑے جن پر سدا گھوڑوں کی لید، میووں کے چھلکے، چوسی ہوئی گنڈیریاں، کاغذ کے پرزے، سگریٹوں کے ٹکڑے، مٹی کے آبخورے، پان کی پیک، پیشاب اور دوسری نجاستیں سب کچھ ان پر ہوتا ہے۔

ان سڑکوں کے معرضِ گمنامی اور مذلت میں پڑے رہنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ لاہور پر دراصل جاگیردار اور سرمایہ دار سڑکوں کا راج ہے۔ مال روڈ، انارکلی، میکلوڈ روڈ وغیرہ نے لاہور کو اس طرح گھیر رکھا ہے کہ بیچاری یہ سڑکیں برسوں سے دہلی دروازے اور موچی دروازے کے اندر داخل نہ ہو سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ کتے کے بھی دن پھرتے ہیں تو سڑک کے کیوں نہ پھریں گے۔ جب کہ کتا خالصتاً سڑک کا باشندہ ہوتا ہے۔

(تالیاں)

خواتین، حضرات اور بچے!

میں آخر میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر لاہور میں سڑکیں نہ ہوتیں تو کیا ہوتا ؟ ایک بار میں نے اسی نوعیت کا ایک خواب دیکھا تھا۔ وہ خواب کچھ اس قسم کا تھا۔ کہ ہمارے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خاں نے عادتاً اپنی قوم سے مشورہ کئے بغیر یہ فیصلہ کر لیا کہ

پاکستان نہ تو "کامن ویلتھ" میں رہے گا اور نہ "اینگلو امریکن بلاک" میں۔ وہ بالکل آزاد اور خود مختار رہے گا۔ ان کے اس فیصلے سے وزیر اعظم انگلستان مسٹر کلیمنٹ ایٹلی اور ممالک متحدہ امریکہ کے صدر مسٹر ٹرومین کو اتنا غصہ آیا۔ کہ انہوں نے حکم دے دیا کہ پاکستان کے سارے شہروں کی سڑکیں بحق کامن ویلتھ اور اینگلو امریکن بلاک ضبط کر لی جائیں۔ بس پھر کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لاہور کی سڑکیں غائب ہو گئیں اور باشندگان لاہور اپنے اپنے گھروں میں قید ہو گئے۔ کھڑکیوں اور دروازوں میں بھیڑ لگی ہے۔ مگر باہر نکلیں تو کیسے نکلیں اور نہ نکلیں تو کیسے نہ نکلیں ——— تنگ آمد بجنگ آمد۔ گھروں میں "آل ہاؤس روڈ لیگ" قائم ہوئی۔ مطالبۂ استرداد سڑک پاس ہوا اور لوگوں نے اپنے اپنے گھروں میں چھت شگاف نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

"سڑکیں واپس کر دو۔ پاکستان لے لو"

"اینگلو امریکن بلاک میں شامل ہو جاؤ"

"لیاقت علی کامن ویلتھ میں جاؤ"

"ہم کشمیر کو نہیں برما کو اسلحہ دیں گے"

"ہماری سڑکیں زندہ باد"

عوام کی اس ناسمجھی کی حرکت پر مسٹر لیاقت علی خاں اور خواجہ ناظم الدین کو بڑا افسوس ہوا کہ آخر اس قوم کی غیرت کو کیا ہوا کہ یہ نہ اینگلو امریکن بلاک میں شامل ہونا

چاہتی ہے۔ نہ کامن ویلتھ میں رہنا پسند کرتی ہے۔ کشمیر کی بجائے برما کو اسلحہ کی امداد دینا چاہتی ہے۔ ایک دو بار تو لیاقت علی خاں کو اتنا غصہ آیا کہ ان کا جی چاہا کہ لیڈری اور وزارت دونوں کو چھوڑ دیں۔ بھلا ایسی ناسمجھ قوم کی رہنمائی کرنا یا اس کا وزیر اعظم بننا کیا ضروری ہے۔ لیکن انہیں قوم پیاری ہے۔ لیڈر کے لئے اس کی قوم اس کی اولاد ہوتی ہے اور اولاد کسے پیاری نہیں ہوتی۔ اولاد کی ضد پوری کرنا بھی عین تقاضائے ہدایت ہے۔ چنانچہ وہ ادھر کامن ویلتھ کانفرنس میں شامل ہونے لندن گئے اور ادھر میری آنکھ کھل گئی۔ یعنی بقولِ شاعر ؎

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"

خواتین حضرات اور بچے!

مجھے بڑی حیرت ہے کہ میری اتنی مختصر تقریر کے باوجود آپ میں سے ابھی تک کسی نے جمائی نہیں لی۔ ایک آدمی بھی نہیں اونگھا۔ ایک آدمی بھی نہیں سویا۔ سب بھلے چنگے بیٹھے ہیں۔ یہ میرے وصفِ خطابت کی سراسر توہین ہے۔ حتیٰ کہ میں نے ایک خواب بھی بیان کر دیا۔ اس کا بھی آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ مجھے آپ کے اس طرزِ عمل کا بڑا صدمہ ہے خدا آپ پر اپنی رحمت نازل کرے اور مجھے از سرِ نو تقریر شروع کرنے کی توفیق دے تاکہ میں دیکھوں کہ آپ کب تک جاگتے رہتے ہیں۔

حضرات! بالکل آخر میں مجھے یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی۔ کہ آپ کے آگے تقریر کرنا تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے انسانوں کے آگے گدھا بین بجا رہا ہو۔

پیٹ بڑا بدکار ہے بابا

پیٹ کوئی محتاجِ تعارف حصۂ جسم نہیں۔ پیٹ کا تعارف کرانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا ـــــ دنیا کا ہر انسان جانتا ہے کہ پیٹ کیا ہوتا ہے اور اس لئے جانتا ہے کہ اس کے جسم میں پیٹ لازمی طور پر لگا ہوتا ہے۔ آج تک کوئی انسان بغیر پیٹ کے اور کوئی پیٹ بغیر انسان کے نہیں تخلیق ہوا۔ ہاں البتہ بحوالۂ الف لیلیٰ، ہزار داستان یہ روایت مرقوم ہے اور اب مرحوم ہے کہ ایک انسان بغیر پیٹ کے پیدا ہونا چاہتا ہے۔ مگر قدرت نے بمعہ اپنے قوانین اس سے ایسا انتقام لیا کہ بیچارہ پیدا ہونے سے پہلے مر گیا اور جس کے بارے میں ہمارا مشہور و معروف شاعر (جو نثری مضامین میں اپنے اشعار اور مصرعوں کو بطورِ مقولہ جڑ دینے کا پرانا عادی رہا ہے) صرف ایک ہی مصرع کہہ سکا کہ

حسرت اس غنچہ پہ جو بن کھلے مرجھا گیا

اس روایت کے بعد یہ حقیقت ٹھوس اور جاندار بن جانے کے علاوہ پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے کہ انسان کو پیٹ سے کبھی چھٹکارا نہیں ۔۔۔ انسان چاہے دنیا بھر کا سرکش ترین مطلق الحکم اور خود مختار بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، وہ بھی پیٹ سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا مثالیں موجود ہیں کہ شداد اور فرعون کے بھی پیٹ تھا اور شداد اور فرعون بھی عام انسانوں کی طرح پیٹ ہی سے پیدا ہوئے تھے۔

کہنے کا مطلب دراصل یہ ہے کہ ادنیٰ ہو یا غریب، تونگر ہو یا فقیر، یا بادشاہ شہر کا یا ملک کا وزیر۔ مرد ہو یا عورت سبھی کے پیٹ ہوتا ہے (یعنی لگا ہوتا ہے) ویسے یہ سچ ہے پیٹ انسان کا اور انسان پیٹ کا ازلی دشمن ہے۔ دونوں شدید دشمنی کے باوجود ایک دوسرے سے ہر دم نالاں رہنے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ سائے کی طرح چمٹے رہتے ہیں۔ سنا ہے کہ اللہ میاں نے انسان کو گیہوں کھانے کی سزا کے طور پر جنت سے یونہی نہیں نکالا۔ بلکہ پیٹ لگا کر اُتارا۔ تاکہ وہ مسلسل عذاب میں مبتلا رہے۔ یعنی دنیا میں پہنچ کر بھی سزا بھگتتا رہے۔ آپ نے اپنے زیادہ عقلمند لوگوں سے سنا ہوگا۔ کہ پیٹ ایک دوزخ ہے اور یہ دوزخ اس لئے انسان کے ساتھ لگی ہے کہ وہ کہیں اس دنیا کو جنت نہ بنا ڈالے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زمین ہی کا نہ ہو کر رہ جائے۔

پہلی بار پہلا انسان جب زمین پر اُترا۔ اس وقت جسم کے جس حصے نے پہلی بار اس کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ پیٹ ہی تھا اور سب سے پہلا کام انسان نے جو کیا۔ وہ پیٹ بھرنا تھا۔ درختوں سے پتے نوچ نوچ کر اس نے اپنا پیٹ بھرا اور اسے پتہ چل گیا کہ

پیٹ کیا ہے اور پیٹ کیا مانگتا ہے؟

پھر اُس نے پیٹ بھرنے کے لئے دماغ سے مدد لی اور جیسے جیسے اس کا دماغ پھیلتا گیا۔ اسے معلوم ہوتا گیا کہ پیٹ کیا کیا مانگتا ہے۔ پھر اُس نے پیٹ کو باضابطہ طور پر بھرنے کے لئے جانوروں کا شکار سیکھا اور اناج اُگانے والے کھیت بنائے۔ اس طرح پیٹ بھرنا شروع کیا۔ لیکن صاحب پیٹ ہی گویا کوئی جادو کا ڈول ہے۔ کہ دُنیا کے پہلے دن سے بھرا جا رہا ہے۔ لیکن ہزاروں سال گزر گئے۔ ابھی تک بھرا نہ جا سکا اور شائد کبھی نہ بھرا جا سکے۔ وُہ جتنا بھرتا جائے گا اور اتنا ہی خالی ہوتا جائے گا۔ اگر وُہ خالی نہ ہوتا رہے تو پھر سمجھئے کہ وُہ کسی دن آپ کو ضرور لے ڈُوبے گا۔

انسان کی تخلیق، نزول یا پیدائش کے بارے میں یُوں تو سینکڑوں روائتیں ہیں۔ مثلاً وُہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کرنے بھیجا گیا۔ یا زمین کو دریافت کرنے، اس کی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانے کے لئے تخلیق کیا گیا۔ زمین کو آباد کرنے، سجانے اور سنوارنے کے لئے نازل کیا گیا۔ مگر روائت میں روائت یہ روائت دراصل روائت ہے کہ وُہ صرف پیٹ کی خاطر زمین پر آیا۔ ویسے اللہ میاں نے اسے دوسری ساری مخلوقات پر اس لئے فوقیت دی کہ اس کے پاس عقل ہے اور زبان ہے۔ اسے اشرف المخلوقات کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ اللہ میاں کو اُمید تھی کہ انسان دوسری ساری مخلوقات کے مقابلے میں زیادہ بہتر طریقے پر حقِ بندگی ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

مگر جناب یہ خلیفہ جی "بندگی میں بھی آزاد و خود بیں" ہیں۔ اُنھوں نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر

بس پیٹ بھرنا شروع کر دیا۔ عقل اور زبان کو استعمال کیا بھی تو پیٹ کے لئے۔ دُنیا میں خدا کی حکومت قائم کی بھی تو پیٹ کے لئے۔ زمین اور اُس کے اتال پاتال چھان ڈالے بھی تو پیٹ کے لئے ۔۔۔ حتیٰ کہ اُس نے اس سارے کرۂ ارض کو نظامِ شمسی کا پیٹ بنا ڈالا۔

انسانی زندگی کے ابتدائی دَور میں پیٹ دیوتا کی طرح پوجا جاتا رہا ۔۔۔ اور آج بھی پوجا جاتا ہے۔ چنانچہ آپ نے سُنا ہوگا کہ اکثر لوگ روٹی کھانے کو "پیٹ پُوجا" کہتے ہیں۔ مثلاً:۔

"میں ذرا پیٹ پُوجا کے لئے جا رہا ہوں"

"کیوں بھئی آپ پیٹ پوجا کر آئے ؟"

"کہئے جناب کچھ پیٹ پوجا کا بھی انتظام ہے یا نہیں"

انسان کی مذہبی تواریخ کا بہ نظرِ غائر یعنی گہرا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان جس شدّت سے پیٹ پوجا کرتا ہے۔ کوئی اور پوجا اتنی شدت سے نہیں کرتا۔ کسی اور پوجا سے پہلے پیٹ پوجا بے حد ضروری ہوتی ہے۔ ورنہ جس کے پیٹ میں کچھ بھی نہ ہو۔ وہ پوجا کرے تو کیسے کرے۔ پوجا کرتے کرتے بھوک کے مارے غش کھا کر گر پڑے گا اور پوجا پاٹ سب کچھ بھول جائے گا۔

دراصل دُنیا کا پیٹ سے بڑا تعلق ہے۔ اگر آپ کا پیٹ بھرا ہوا ہے تو ساری دُنیا حسین و خوبصورت ہے۔ اگر پیٹ خالی ہے تو ساری دُنیا بدصورت اجاڑ اور ویران

جگہ ہے۔ اسی کو شاعر نے بڑے مزے میں کہا ہے۔

جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے۔ اس وقت یہ شبنم موتی ہے۔ یعنی پیٹ میں روٹی ہو تو پھر شبنم بھی موتی نظر آتی ہے۔

اگر پیٹ میں روٹی نہ ہو تو موتی بھی شبنم کی بوند نظر آتی ہے اور اس کے آگے فلسفہ و تصوّف شروع ہوتا ہے۔

اس لئے فلسفہ و تصوّف کی طرف رجوع کرنے سے پہلے ہمیں بلا چون وچرا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پیٹ نہ صرف تخلیق کا منبع و سرچشمہ ہے۔ بلکہ مرکزِ حیاتِ انسانی ہے۔ پیٹ گویا کوئی بہت ہی بڑا مقناطیس ہے جس کے اطراف و اکناف سے زندگی کے سارے عوامل و عناصر کھنچے چلے آتے ہیں۔ دُنیا کے کسی انسان کی روزمرّہ زندگی کا مطالعہ کیجئے اور پیٹ کی کارستانی یا کارستانیاں ملاحظہ فرمایئے۔ ہر روز صبح وُہ بستر سے اُٹھتا ہے اس لئے اُٹھتا ہے کہ کام پر چلا جائے۔ کام پر اس لئے جاتا ہے کہ روپیہ کمائے۔ روپیہ اس لئے کماتا ہے کہ اناج خریدے۔ اناج اس لئے خریدتا ہے کہ کھانا پکائے کھانا اس لئے پکاتا ہے کہ پیٹ بھرے اور پیٹ اس لئے بھرتا ہے کہ اگر پیٹ نہ بھرے تو پھر زندگی سے بھر پائے۔ اب اس کے دن بھر کی زندگی کا خلاصہ کیجئے تو بھی خلاصہ ہو گا کہ زندگی پیٹ کی خاطر ہے اور پیٹ زندگی کی خاطر یعنی انسان کا خلاصہ پیٹ۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کوئی نئی باتیں نہیں بتا رہا ہوں۔ یہ سب باتیں تو آپ پہلے ہی سے جانتے ہیں۔ لیکن میں اپنی جگہ بضد ہوں کہ یہ باتیں آپ کے لئے پُرانی ہونے

کے باوجود ہردم ہر لحظہ ہر آن نئی ہیں۔ آپ نے پیٹ سے اتنے قریب رہنے کے باوجود نہ تو پیٹ کے بارے میں کبھی کچھ سوچا ہے اور نہ اس کے بارے میں آپ کچھ جانتے ہیں آپ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ جہاں آپ کا پیٹ خراب ہوا۔ آپ نے مسہل لے لیا۔ یا روزانہ کے معمول کے مطابق جب پیٹ خالی ہوا۔ آپنے اُسے بھر لیا۔ یا پھر اگر آپ کا پیٹ کسی وجہ سے بڑھ رہا ہو۔ تو آپ نے اُسے کم کرنے کی خاطر درزشوں کی طرف توجہ دی۔ لیکن آپ ایمان سے کہیں اور قسم کھا کر بتائیں کہ ان کے علاوہ بھی آپ نے پیٹ کے بارے میں کبھی کچھ سوچا ہے؟ — جب کہ پیٹ زندگی کے سارے فساد کی جڑ ہے۔ آپ نے کبھی پیٹ کی تاریخ اور پیٹ کی سیاست کی طرف کبھی توجہ کی ہے؟ جبکہ پیٹ بالکلیہ ایک تاریخی اور سیاسی حصّہ جسم ہے۔

پیٹ کا انسانی تاریخ وسیاسیات سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے انسانی سماج میں اوّل اوّل جب ملکیت کا جھگڑا شروع ہوا۔ یعنی انسان ہر بات پر جھگڑنے لگا کہ "یہ میرا ہے، یہ تیرا ہے" تو اس جھگڑے سے انسان دو حصّوں میں بٹ گیا۔ امیر انسان، غریب انسان۔ یہ جھگڑا اس لئے شروع ہوا کہ ہر انسان اپنا پیٹ زیادہ سے زیادہ بھرنا چاہتا تھا۔ ملکیت کا بھی پیٹ سے گہرا تعلق ہے انسان ملکیت کا محض پیٹ کی وجہ سے دلدادہ ہے۔ ملکیت کے جھگڑے دراصل پیٹ کے جھگڑے ہیں۔ اگر پیٹ نہ ہوتا۔ ملکیت اور جائداد کی ضرورت ہی کیا تھی۔ (اوّل تو انسان ہی نہ ہوتا اگر پیٹ نہ ہوتا) لیکن چونکہ پیٹ ہے اس لئے جھگڑا بھی ہے۔ جھگڑا کیا

جنگ بھی ہے۔ ہر شخص خواہ وُہ مورخ ہو یا نہ ہو بہ آسانی اس حقیقت کو ثابت کر سکتا ہے
کہ دُنیا میں سارے جھگڑے، ساری لڑائیاں اور ساری جنگیں پیٹ کی خاطر لڑی جاتی ہیں
خواہ وُہ جھگڑا انار کلی بازار کے دو آدمیوں کے درمیان ہوا ہو۔ یا وُہ جنگِ عظیم ہو سبب
کی وجوہات میں کہیں نہ کہیں ہمیں پیٹ چھپا ہوا نظر آئے گا (پیٹ بالعموم چھپا ہوا ہوتا ہے)
اس کو ثابت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جب کہ ہم میں سے ہر انسان کم از کم ایک
قمیص یا کرتا تو پہنے ہی رہتا ہے۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ اس دُنیا میں ہزاروں لاکھوں
انسان ایسے بھی ہیں۔ جن کے پیٹ ننگے ہیں مگر اس کی وجہ بھی تو پیٹ ہی ہے۔ بعض
لوگ اپنے پیٹ کو چھپانے کے لئے نہ صرف بنیان، قمیص، کوٹ اور جمپر اور جانے
کیا کیا پہن لیتے ہیں۔ اس طرح ایک ایک آدمی چھ چھ آدمیوں کے کپڑے خود پہن لیتا ہے
اور اس طرح ایک آدمی کی زیادتی کے باعث چھ آدمیوں کے پیٹ ننگے ہو جاتے ہیں
دُنیا کے ہر سات آدمیوں میں ایک آدمی کا پیٹ ڈھکا یا چھپا ہوا ہوتا ہے اور چھ
آدمیوں کے پیٹ ننگے ہوتے ہیں اور اس لئے ہوتے ہیں، کہ ایک آدمی اپنے پیٹ میں
چھ آدمیوں کی غذا ٹھونس کر بھر لیتا ہے۔ اس کے بعد اسے ان چھ آدمیوں سے اپنا پیٹ
چھپانے کے لئے چھ آدمیوں کے کپڑے بھی پہننے پڑتے ہیں۔ لیکن لوگ کہتے ہیں۔ کہ
عشق اور بڑا پیٹ چھپاؤ لاکھ پردوں میں وُہ ہرگز نہیں چھپ سکتے۔ انسانی سماج کے
اس طرح دو واضح گروہوں میں بٹ جانے کا اثر پیٹ پر بھی پڑا اور پیٹ بھی دو گروہوں
میں تقسیم ہو گئے۔

(۱) بڑا پیٹ

(۲) چھوٹا پیٹ

بڑا پیٹ سے میری مراد بڑی عمر کے آدمی کا پیٹ نہیں ہے بلکہ مالدار آدمی کا پیٹ ہے۔ اسی طرح چھوٹا پیٹ سے میری مراد ہرگز کسی بچّے کے پیٹ سے نہیں ہے۔ بلکہ غریب آدمی کے پیٹ سے ہے۔

اب غالباً میری بات یا میری بات کا مقصد آپ کے ذہن نشین ہو گیا۔ اب آپ مطمئن ہیں۔ اس لئے لا یئے ہاتھ اور سُنئے بات کہ دُنیا میں بڑے پیٹ بہت کم اور چھوٹے پیٹ بہت زیادہ ہیں۔ بڑے پیٹ اور چھوٹے پیٹ میں بڑی سخت دشمنی ہے اور یہ دشمنی اس وقت شروع ہوئی۔ جب سے کہ شروع ہونی چاہئے تھی۔ یعنی کہ اسی وقت سے جب سے کہ ملکیت کے تصور نے ایک آدمی کو بڑا اور دوسرے کو چھوٹا بنا دیا یعنی جس دن انسان نے دُنیا کی ہر چیز کی قیمت چاندی کا سکّہ قرار دے دی۔ جس کے پاس زیادہ چاندی کے سکّے ہوں۔ وُہ زیادہ بڑا پیٹ خرید سکتا ہے اور جس کے پاس چاندی کا ایک سکّہ بھی نہ ہو تو پھر سمجھ لیجیے کہ اس کے پاس پیٹ بھی نہیں ہے۔

ابھی ابھی اوپر (اوپر سے میرا مطلب یہ نہیں کہ مکان کی بالائی منزل یا چھت پر بلکہ اُوپر کے کسی پیراگراف میں) میں نے یہ عرض کیا تھا کہ دُنیا کے ہر سات آدمیوں میں ایک آدمی کا پیٹ ڈھکا ہوا اور چھ آدمیوں کے پیٹ ننگے ہوتے ہیں۔ اب نیچے یعنی یہاں یہ عرض کرتا ہوں کہ دُنیا کے ہر سو آدمیوں میں سے پانچ آدمیوں کا پیٹ بڑا اور بھرا ہوتا ہے

اور ۹۵ آدمیوں کا پیٹ چھوٹا، کھوٹا، خالی ہوتا ہے۔ اس کی بھی یہی وجہ ہے۔ یہ پانچ پانچ آدمی پچانوے آدمیوں کی غذا خود کھا جاتے ہیں۔ اب یہاں آپ میرا مضمون پڑھنے کے سوچ رہے ہونگے۔ کہ کیا یہ آدمی یا دیو یا جن یا بھوت یا شیطان ہوتے ہیں جو ۹۵ آدمیوں کی غذا کھا جاتے ہیں۔ آپ بالکل ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ مگر یہ نہ دیو ہیں نہ جن نہ بھوت ہیں نہ شیطان ہیں بلکہ یہ تو امیر آدمی ہیں اور امیر آدمی تو جن، دیو، بھوت اور شیطان سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ جن، دیو، بھوت، شیطان تو امیر آدمی کے غلام ہوتے ہیں اور امیر آدمی ان کا سردار، جس کے اشارے پر یہ نگنی کا ناچ، نٹ کا ناچ رمبھا کا ناچ، کیبرے ناچ غرض ہر قسم کا ناچ ناچتے ہیں۔

پہلے پہل جب انسان جاہل اور بیوقوف تھا تو یہ سوچا کرتا تھا کہ چلو جی کوئی بات نہیں ہے۔ خدا نے کسی کا پیٹ بڑا بنایا ہے اور کسی کا چھوٹا جس کی تقدیر میں چھوٹا پیٹ لکھا ہے۔ وُہ چھوٹا آدمی بن گیا اور جس کی قسمت میں بڑا پیٹ وُہ بڑا آدمی بن گیا۔ یہ بات کچھ ایسی چل نکلی کہ بس چل ہی نکلی۔ مگر بعض آدمی جو نہ بڑے تھے اور نہ چھوٹے۔ وُہ بڑے "کھوجی" تھے۔ جنہیں انگریزی میں ریسرچ اسکالر کہا جاتا ہے۔ یعنی بات بات میں کھوج کرنے والے۔ انہوں نے بات کی کھوج کرنی شروع کی تو حیران رہ گئے کہ بھئی وا۹ عجیب ہے۔ یہ پیٹ تو سب انسانوں کا ایک ہی جیسا ہے۔ شہنشاہ جارج ششم یا لیاقت علی خاں کا پیٹ بھی ویسا ہی ہے۔ جیسا کہ مشہور فاقہ کش نوجوان مسٹر ابراہیم جلیس بی اے کا ہے۔ پھر کیا بات ہے کہ جارج ششم، لیاقت علی خاں بڑی بڑی سلطنتوں پر حکومتیں

کرتے ہیں اور مسٹر ابراہیم جلبیس پیٹ کے لیے چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھتا ہے۔ مسٹر ابراہیم جلبیس آدمی بڑا عقلمند وزیرک و ہوشمند تھا۔ وہ بات کی تہ تک پہنچ گیا اور پتہ کر آیا کہ یہ سب بکواس ہے۔ سارے انسان ماں کے پیٹ سے ایک ہی جیسے پیدا ہوئے ہیں۔ ہاں البتہ پیدا ہونے کے بعد انسان نے نئی نئی کمینگیوں کے ساتھ بڑائی چھوٹائی کی تفریق پیدا کی اور یہ تقدیر و قدیر سب ڈھکوسلے ہیں۔ انسان اپنی تقدیر آپ بناتا ہے۔ پیٹ کا تقدیر سے کوئی تعلق نہیں ــــ"

یہ کہہ کر مسٹر ابراہیم جلبیس نے بیچ چوراہے پر خم ٹھونک کر دعویٰ کیا کہ۔

"ہے کوئی جو میری اس بات کی تردید کرے گا۔ اگر ہے تو وہ میرے سامنے آئے"

لیکن سبھوں کی خوش قسمتی کہ کوئی سامنے نہیں آیا۔ سب اُس کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ یعنی اُس کے ہم خیال ہو گئے کہ بھئی یہ مسٹر ابراہیم جلبیس تو بڑا اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے سچ کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے کہ دُنیا کا ہر آدمی ایک پیٹ کی ضرورت سے زیادہ نہ کھائے تو پھر دُنیا میں نہ بڑا پیٹ باقی رہے اور نہ چھوٹا پیٹ ــــ سب پیٹ برابر یکساں اور مساوی ہو جائیں اور پھر کسی کو پیٹ چھپانے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

لیکن کہاں صاحب! ــ کون آدمی ہے جو صرف ایک پیٹ کی ضرورت کی حد تک ہی کھانا چاہتا ہو۔ انسان تو فطرتاً اتنا لالچی ہوتا ہے کہ وہ پیٹ کے علاوہ حلق تک کھا جاتا ہے۔ آپ نے ایک لالہ جی کی حکائت سُنی ہو گی۔ وہ لالہ جی پیٹ بھرنے

کے علاوہ بعد بھی کھانے کے عادی تھے۔ ایک بار وہ اتنا کھا گئے کہ ڈاکٹر کو بلانا پڑ گیا
ڈاکٹر نے انہیں ایک خوراک دوائی پلانی چاہی تو لالہ جی نے بصد حسرت دیاس کہا۔
"ڈاکٹر صاحب۔ اگر ایک خوراک دوائی کی جگہ ہوتی تو ایک لڈو اور نہ کھا لیتا۔"
آپ ہنسیں گے، مگر یہ قصہ محض ہنسنے کا نہیں بلکہ عبرت پکڑنے کا ہے سوچنے اور
غور کرنے کا ہے کہ لوگ آخر اتنا کیوں کھاتے ہیں؟ اس کا سیدھا سادھا جواب یہ ہے
کہ لوگ پیٹ بھر کر کھانے کے علاوہ "جی بھر کر" کھانا چاہتے ہیں۔ کبھی کبھی بیچارا پیٹ تو
بھر جاتا ہے۔ مگر جی نہیں بھرتا اور "جی" کبھی نہیں بھر سکتا۔ بعض لوگ "جی" کو "نیت" بھی
کہتے ہیں مگر ان بعض لوگوں کا ذکر ہی کیا جب کہ وہ خود بدنیت ہیں۔

انہی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسان کی اس بُری عادات پیٹ بھر کر یا جی بھر کر
کھانے کی عادت کے باعث دُنیا میں بڑی بُرائیاں پھیل رہی ہیں۔ امیر و غریب کا جھگڑا
تو خیر پیٹ ہی سے پیدا ہوا ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ پیٹ کا انسانی اخلاق و کردار پر
بھی بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ انسان بذاتِ خود نہ اچھا ہے نہ بُرا۔ یہ تو صرف جناب
پیٹ ہیں جو اس کو بُرا یا اچھا بناتے ہیں۔ اسی لئے بہت سے لوگ بہ یک آواز
ہو کر کہتے ہیں۔

پیٹ بڑا بدکار ہے بابا

پیٹ کو آج تک کسی شخص نے بھی نیکوکار نہیں کہا ہے۔ اس لئے کہ انسان
پیٹ کی وجہ سے انسان ایسی ایسی شرمناک، خوفناک، ہیبت ناک، الم ناک، عبرتناک

خطرناک برائیوں کا شکار ہوتا ہے کہ اس پر ایک لمحہ کے لئے سوچا جائے تو ناک نیچی
ہو جاتی ہے۔ اب یہ سُن کر آپ لاکھ ناک بھنویں چڑھائیں مگر دیکھئے تو سہی کہ یہ کتنی
شرمناک بات ہے کہ پیٹ کی خاطر مرد اپنی عورت کی یا عورت خود اپنی عصمت بیچتی ہے
والدین اولاد فروخت کر دیتے ہیں، عزیز سے عزیز رشتہ دار ایک دوسرے کو
دھوکہ دیتے ہیں۔ پیٹ کی خاطر آدمی سربازار ناچتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے خود ناچنے سے
شرماتا ہے تو بندر نچاتا ہے۔ پیٹ کی خاطر آدمی مسجد سے جوتیاں، مندر سے مورتی اور
قبرستان سے کفن چراتا ہے۔ پیٹ کی خاطر آدمی اپنے ہی جیسے آدمی کے آگے سر
جھکائے کھڑا رہتا ہے۔ اس کے پیروں میں سر دے دیتا ہے۔ پیٹ ہی کی خاطر
ایک آدمی اپنے ہی جیسے آدمی کی گالی اور جھڑکی سنتا ہے اور پھر کندھے جھٹک کر چپ
ہو جاتا ہے۔ پیٹ کی خاطر آدمی عشق کرتا ہے اور جب دمشق میں قحط سالی ہوتی ہے
تو عشق بھول جاتا ہے۔ پیٹ کی خاطر آدمی خودکشی اور فوج کشی کرتا ہے۔ پیٹ کی
خاطر آدمی بازار لگاتا اور چور بازاری کرتا ہے۔ پیٹ کی خاطر آدمی مکان بناتا اور قبر
کھودتا ہے۔ پیٹ کی خاطر آدمی کنواں کھودتا ہے اور پیٹ سے تنگ آ کر اس میں
چھلانگ لگا دیتا ہے۔ پیٹ کی خاطر آدمی دن بھر اور رات بھر کام کرتا ہے۔ دنیا جہان
کی خاک پھانکتا ہے۔ ساری تکلیف پیٹ کی خاطر سہتا ہے مگر پھر اس کم بخت کو ہر دم
بڑے پیار سے سہلاتا رہتا ہے۔ جیسے سچ مچ اسے اس سے بڑا پیار ہے۔ القصہ مختصر
آدمی پیٹ کے لئے پیدا ہوتا ہے اور پیٹ کی وجہ سے مرجاتا ہے۔ صرف ایک بنگال کا

قحط کیا دُنیا کے ہر ملک، ہر شہر میں بڑے بڑے قحط پڑتے رہے ہیں۔ پڑتے ہیں آئندہ بھی پڑتے رہیں گے۔

لیجئے۔ اصلی بات تو باتوں باتوں میں کہیں دور ہی جا پڑی۔ اصلی بات تو یہ ہے کہ اس دُنیا میں انسان کو ایک معیاری پیٹ کی ضرورت ہے جو نہ بڑا ہو نہ چھوٹا بلکہ یکساں ہو جو ضرورت سے زیادہ یعنی بلا ضرورت نہ بھرے۔ ایسا "معیاری پیٹ" جب عالم وجود میں آجائے تو پھر انسان کا رونا آہیں بھرنا زندگی سے شکوے کرنا بھوکے مرنا اور ایسی ساری خرافات کو انسان زندگی سے یوں نکال باہر کرے گا۔ جس طرح نیک شوہر بدچلن عورت کو، باپ آوارہ بیٹے کو، آقا بے ایمان نوکر کو، حلوائی دودھ کی مکھی کو، اور کاتب صاحبان حرف غلط کو نکال پھینکتے ہیں۔

اس کے بعد دُنیا کے سنور جانے کی اُمید ہے۔ دُنیا یقیناً سنور جائے گی وہ دن اب سے دور تو نہیں ہے۔ کیونکہ آج کل جگہ جگہ بم اور بڑے بڑے پیٹ بڑے زوروں سے پھٹتے جا رہے ہیں۔ اسی لئے آیئے اُس دن کے انتظار میں ہم کوئی پیٹ سے متعلق ترانہ گائیں اور پیٹ پر پتھر باندھ کر نعرے لگائیں۔

بڑا پیٹ مردہ باد

چھوٹا پیٹ مردہ باد

معیاری پیٹ زندہ باد

میں بذاتِ خود معیاری پیٹ کا بڑا پُرجوش حامی ہوں۔ اس کے لئے اپنی جان

تک دینے کے لئے تیار ہوں۔ کیونکہ پیٹ کے لئے مضمون لکھتے لکھتے بہت
تنگ آگیا ہوں۔ دعا کیجئے کہ میرا خاتمہ بالخیر ہو۔ آمین۔

پاک طوائف کے نام

(ایک "راز" کا خط)

مائی ڈیر کراچی کی طوائف!

سلامِ محبت اور عید مبارک

میں یہاں لاہور میں خیریت سے رہ کر تمہاری خیریت کراچی میں بدرگاہِ الٰہی سے نیک چاہتا ہوں۔ خدا کرے کہ حکومت پاکستان تمہیں جلا وطن نہ کرے اور بقول شاعر تمہارا ع

اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

اب دیگر احوال یہ ہے کہ عرصے سے تمہیں ایک ایسا راز کا محبت نامہ لکھنے کے لئے تڑپ رہا تھا کہ پڑھ کر تم بھی تڑپ تڑپ جاؤ۔ ادھر کچھ دنوں سے میں

روزانہ اخبارات میں پڑھ رہا ہوں کہ تم آج کل سارنگی کے نغمے، طبلے کی تھاپ اور تمہاری اپنی رس بھری میٹھی آواز سے گونجنے والا، جگمگاتا، مہکتا کوٹھا چھوڑ کر سیاست کے میدان میں کود پڑی ہو۔ واللہ ڈیر۔ اس خبر نے مجھے بے انداز خوشی بخشی ہے کہ اب تم میں بھی سیاسی شعور پیدا ہو چکا ہے۔ ویسے میرے محترم بزرگ الحاج خدا بخش مدظلہ بڑے ناک بھوں چڑھا کر فرماتے ہیں کہ یہ بھی قربِ قیامت کی ایک دلیل ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ جب طوائف اپنے کوٹھے سے میدانِ سیاست میں کود پڑے گی تو سمجھو کہ قیامت بہت ہی قریب آ گئی ہے۔ معلوم نہیں کہ حضرت محترم الحاج حافظ خدا بخش مدظلہ درست فرماتے ہیں یا نہیں۔ یہ بات البتہ بالکل سچ ہے کہ قیامت قریب ہو یا نہ ہو ـــــ تم تو ضرور قیامت ہو۔

کل کے اخبار میں میں نے ایک دلچسپ خبر پڑھی ہے کہ تم نے کراچی کی ساری طوائفوں کو ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک کر کے ایک جلوس کی شکل میں دارالخلافہ مملکتِ اسلامیہ پاکستان بلادِ کراچی کی شاہراہوں کو رنگین و معطر بنایا اور پھر اپنے محبوب وزیر اعظم آنریبل نواب زادہ لیاقت علی خاں کے عالیشان محل پر ہنگامہ مچایا۔ میں نے جب سے یہ خبر پڑھی ہے کچھ ایسا بے چین ہو گیا ہوں کہ دن کا چین اور رات کی نیند حرام کر کے فوراً یہ خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں، فوراً اس لئے کہ کہیں اور کوئی ـــــ میرا رقیبِ رُوسیاہ ایسا ہی کوئی خط تمہیں نہ لکھ ڈالے اور میں یا تم یا پھر دونوں مُنہ دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔

یہ خبر چونکہ بڑی تشویش ناک ہے۔ اس لئے اپنی تشویش کو رفع کرنے کے لئے اور تمہاری ناک کو بلند رکھنے یا کٹنے سے بچانے کے لئے چند پند و نصائح تمہیں لکھ کر بھیج رہا ہوں تاکہ آئندہ کسی ملاقات میں تم یہ طنزیہ غزل جس کا مطلع ہے۔

اب بتایا تو کیا بتایا ہے
جبکہ پانی گزر گیا سر سے

میرے سامنے گا کر مجھے اور میری آنے والی نسلوں کو شرمندہ نہ کرو۔ دھیان رکھنا۔ یہ باتیں راز اور صرف راز کی باتیں ہیں۔ خلوت کی باتیں ہیں۔ جلوت کی نہیں۔ لیکن چونکہ تمہاری خلوت بھی جلوت زدہ ہوتی ہے۔ اس لئے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں تم یہ باتیں ساری دُنیا سے نہ کہدو یا کسی اخبار میں نہ چھپوادو۔ تم تو جانتی ہو کہ ہر جمہوری ملک کی طرح پاکستان میں بھی پبلک سیفٹی ایکٹ ایسی راز کی باتیں کرنے والے کو جیل کی ہوا کھلاتا ہے ــــ اور تم یہ بھی جانتی ہی ہو کہ مجھے "ہوا خوری" کی مطلق عادت نہیں۔ اس لئے احتیاط برتنا ضروری ہے۔ یہ باتیں صرف تمہارے میرے اور بستر کے تکیے کے درمیان محدود رہنی چاہئیں یہ تاکید پر تاکید ہے۔

میں تمہاری ساری سیاسی حرکتوں سے بالکلیہ متفق ہوں۔ تم نے انجمن تحفظِ حقوقِ طوائفانِ پاکستان قائم کر لی۔ بہت اچھا کیا۔ شاباش۔ اگر تم اس وقت میرے پاس ہوتیں تو میں تمہاری پیٹھ ٹھونکتا۔ لیکن چونکہ پاس نہیں ہو۔ اس لئے پیٹھ ٹھونکنے کا موقع ہی کہاں ہے؟ تم نے اپنے اور اپنی برادری (اوہ معاف کرنا) اپنی "ہمشیرگی" کے حقوق کے تحفظ

کی خاطر مجلس عاملہ کا جلسہ کیا۔ اس میں قراردادیں منظور کیں اور ان قراردادوں کو ملک بھر کی طوائفوں کے جلسۂ عام میں منظور کرایا —— بہت ٹھیک کیا۔ یہ بالکل جمہوری طریقۂ کار ہے۔ اس سے کسی انگریز یا امریکن کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ تم نے کراچی کی شاہراہوں پر جلوس نکالا —— یہ بھی ایک مظاہرہ جمہوریت ہے۔

جمہوریت تم پر اور تم جمہوریت پر رہتی دنیا تک ناز کرتی رہو گی۔

مگر ابتدائی پیراگرافوں ہی میں سخن گسترانہ بات آن پڑی ہے کہ جمہوریت را بر طوائف چہ کار ہ —— یہ بات تو سمجھ میں آسکتی ہے کہ طوائف کو جمہوریت سے لگاؤ ہو سکتا ہے لیکن جمہوریت کو طوائف سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ کیونکہ طوائف تو جاگیرداریت، ملوکیت، بادشاہت اور سرمایہ داری کی منظورِ نظر ہے۔ تاریخ عادتاً گواہ دیتی ہے۔ کہ طوائف جاگیرداریت کے بطن سے پیدا ہوئی۔ بادشاہت کے سایۂ ہما پایہ میں پروان چڑھی اور سرمایہ داری کی آغوشِ شفقت میں جوان ہوئی —— تاریخ کی اس گواہی کی روشنی میں مستقبل شناس تاریخ دان یہ بھی پیشین گوئی کرتے ہیں کہ طوائف دورِ جمہوریت میں بوڑھی ہو کر ہمیشہ کے لئے مر جائے گی۔

تم شائد گھبرا رہی ہو کہ ساری دنیا کے علاوہ اب ہمارے وطنِ عزیز میں جمہوریت کا دور دورہ شروع ہو چکا ہے اور تمہارے دن قریب ہیں یا تمہاری شب تاب زلفیں سپید ہونے والی ہیں! —— گھبراؤ نہیں۔ ابھی تمہاری عمر کافی لمبی ہے۔ کیونکہ یہ جمہوریت جو آج ہمارے ملک میں برسرِ اقتدار ہے۔ وہ دراصل "سرمایہ دارانہ جمہوریت" ہے۔ جس کا مفہوم

علامہ اقبال کی نظر میں یہ ہے

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتی ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ یہ شعر معہ دیگر اشعار غزل ریڈیو پاکستان کے چاروں اسٹیشنوں سے تم بارہا گا چکی ہو۔ لیکن چونکہ تم "گانا برائے گانا" کے لئے گاتی ہو۔ اس لئے سمجھ بوجھ سے چھٹی لے لیتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج سمجھ بوجھ کی دنیا میں تمہیں ہر جگہ سے نکالا جا رہا ہے ۔۔۔ مصیبت یہ ہے کہ تم یا تو صرف جسم ہی جسم ہو یا فقط آواز ہی آواز ۔۔۔ کاش جسم کے علاوہ تم تھوڑی سی "عقل" بھی ہوتیں۔ پھر ہم دیکھتے کہ کون تمہیں وہیں نکالا دیتا یا جلاوطن کرنے کی جرأت کرتا

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اب تم نے اپنے وجود کی بقا کی خاطر سمجھ بوجھ سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ زندگی کو بقائے زندگی کی جدوجہد میں بدل دیا ہے۔ آخر تم اپنے جسم اور حسن، اپنی آواز اور غمزے کے سہارے کب تک جی سکتی تھیں۔ موجودہ دُنیا میں تو زندگی بغیر جدوجہد کے گزر ہی نہیں سکتی ۔۔۔ وہ جاگیرداری، بادشاہت اور سرمایہ داری کا دور اور تھا۔ وہ حقیقی اور معنوی دونوں اعتبار سے "طوائف الملوکی" کا دور تھا۔ تم جاگیرداروں کی جاگیردار، بادشاہوں کی بادشاہ اور امیروں کی امیر تھیں۔

میں نے تاریخ پڑھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تاریخِ عالم میں تمہارا کتنا بڑا درجہ تھا۔ بالخصوص یورپ کی تاریخ میں تمہارا جو مقام تھا۔ اُسے تو آبِ زر سے لکھا جانا چاہیے

تھا۔ لیکن چونکہ "آبِ زر" کی دور میں بھی دوات اور فاؤنٹن پن میں بھرا نہ جا سکا۔ اسی لئے بیچارے تاریخ نویس تمہارے آگے ہمیشہ ہمیشہ شرمندہ رہیں گے۔

"طوائف الملوکی" کا دور بھی کیا دور تھا۔ ساری دنیا تمہاری عملداری میں تھی تم نے تو رعایا چھوڑ بڑے بڑے بادشاہوں اور شہنشاہوں پر بھی حکومت کی ہے۔

ابھی کچھ دن ہوئے میں ایک ولائتی مصنف "برن ہارڈ اے بیوز" کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اُس میں ایک جگہ میں نے یہ بھی پڑھا کہ فرانس میں ہر سال کو تین بر دقل یعنی ملکۂ طوائفان کا الکشن ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ ۱۵۲۶ء میں جو طوائف بر اعظم یورپ کی ملکۂ طوائفان منتخب ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں برن ہارڈ نے بڑی دلچسپ تفصیلات دی ہیں۔ لیکن تمہیں تفصیلات کے مقابلے میں تعجیلات سے بڑی دلچسپی رہی ہے اس لئے اس تفصیلات میں جانے سے کیا فائدہ!

تمہیں شاید نہیں معلوم البتہ مجھے معلوم ہے کہ جاگیردارانہ اور ملوکانہ نظامِ حیات میں تم نے نہ صرف بحر و بر پر حکومت کی۔ بلکہ انسان کی تہذیب اور مذہب پر بھی تمہارا بڑا احسان رہا ہے۔ ہیوی لاک ایلس اپنی کتاب جنسی انسائیکلوپیڈیا میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ میں اکثر و بیشتر اُونچے اُونچے میناروں والے کلیسا طوائفوں کی دولت ہی سے تعمیر کئے گئے ہیں۔ خود اپنے ملک میں طوائفوں کی قومی اور ملی خدمات کے بڑے قصے مشہور رہیں۔ میں جامعہ اسلامیہ علیگڑھ کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے یہ جاننا ہوں کہ اس مقدس علم گاہ کی بنیاد میں

دہلی کی طوائفوں کا زیور اور روپیہ بھی گڑا ہوا ہے

ڈبر ــــ تمہاری خاطر قتل و خون کی وارداتیں تو اب بھی ہر جگہ ہوتی ہیں مگر جاگیر دارانہ اور شہنشاہی دور میں تو تمہاری خاطر بڑی بڑی طویل جنگیں لڑی گئیں۔ برسوں پہلے جب تم مادام پامپے ڈور تھیں تو تمہاری خاطر فرانس کے شہنشاہ لوئی پانزدہم نے اسٹریا کو جنگ ہفت سالہ کی آگ میں جھونک دیا تھا۔

پُرانی تاریخ قدم قدم پر تمہاری عظمت اور تمہاری شوکت اور تمہارے دبدبے کے قصے سناتی ہے۔ ایک قصہ تو مجھے کبھی نہیں بھولتا میں نے وُہ قصہ ہسٹری آف پروسٹیٹیوشن کی تیسری جلد میں پڑھا ہے۔ عجیب قصہ ہے۔ جسے یاد کر کے میں تمہاری عظمت کا تصور کرنا چاہتا ہوں تو تصور تک تمہاری عظمت کی بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔

تاریخ کہتی ہے کہ میکسیلین شہنشاہِ جرمنی نے ایک بار سب سے مشہور طوائف کو کسی شاہی تقریب پر گانے کے لیے بُلایا۔ جب وُہ طوائف گا چکی تو شہنشاہ نے پوچھا

"بولو ــــ کیا مانگتی ہو۔"

طوائف نے اتنی رقم کا مطالبہ کیا کہ شہنشاہ نے حیران ہو کر کہا۔

"اتنی رقم تو ہمارے وزیراعظم کو بھی نہیں ملتی۔"

طوائف نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ اپنے وزیراعظم سے کہئے کہ وُہ گانا سیکھیں۔"

اللہ اللہ — دورِ ملوکی اور طوائف الملوکی میں تمہاری کیا عظمت تھی! خود اپنے ملک کے ماضی میں چند لمحوں کے لئے جھانک کر تو دیکھو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ تمہارا کیا مقام تھا، کیا غیرت تھی، کیا شوکت تھی! — مغل بادشاہ اپنے شاہزادوں کو تہذیبِ زندگی کے آداب و اخلاق سکھانے کے لئے طوائفوں کے کوٹھوں پر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ طوائف مغل شاہی کے دور میں معلمِ تہذیب و اخلاق سمجھی جاتی تھی۔ طوائف اہلِ زبان ہوتی تھی۔ طوائف ادیبہ و شاعرہ ہوتی تھی۔ اودھ کی تاریخ میں آپنے الاچی جان خستہ اور دکن کی تاریخ میں چندا بائی کا نام ضرور سنا ہو گا۔ یہ شاعرہ طوائفیں تھیں۔ علم و ادب کی دنیا میں بھی نام پیدا کر گئی تھیں۔

مگر تیل بیچ کر فارسی پڑھنے کے بعد میں نے جو مقولہ از بر یاد کیا ہے۔ وہ ہے ہر عروجے را زوال — اس مقولہ کی رُو سے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اتنے عروج کے بعد زوال لازمی تھا۔ دلگیر نہ ہو مائی ڈیئر — پھر عروج آئے گا۔ اس لئے کہ اُسے آنا ہے۔ اس لئے کہ وہ ہر زوال سے پہلے اور بعد بالعموم آیا ہی کرتا ہے۔

تم شاید یہ سمجھے بیٹھی تھیں کہ تقسیمِ ملک کے بعد تمہیں بھی ایک قومی حیثیت حاصل ہو جائیگی اس لئے تم نے بھی، ماؤنٹ بیٹن پلان کو بہ رضا و رغبت پسند کیا۔ قائدِ اعظم کی اپیل پر تم نے پاکستان فنڈ کے لئے اپنا سارا زیور اور کمائی بطور چندہ دے دیا۔ پاک طوائف کہلانے کے شوق میں تم پاکستان چلی آئیں۔ تمہارے ارادے اور مقاصد یقیناً بالکل نیک تھے اور نیک ہیں۔ مگر تم بھول رہی ہو کہ پاکستان ایک اسلامی حکومت ہے۔ مملکتِ

خداداد ہے۔ اس میں سب خدا رسیدہ اور پاک لوگ رہتے ہیں۔ یہاں فحش اور فاحشہ عورتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ پاکستان کی رعائت سے تم اپنے آپ کو پاک طوائف کہہ لو تو کہہ لو۔ مگر بھلا طوائف بھی کبھی پاک کہی جا سکتی ہے۔ تمہارا یہ خیال غلط اور صحیح ہے کہ پاکستان میں آکر طوائف بھی پاک ہو سکتی ہے۔ تمہارا پاکستان آنا بالکل ہی ایسا ہے جیسے وُہ مشہور و معروف بلی جو نو سو چوہے کھا کر حج کرنے آئی ہو۔

مَیں تمہارا دل رکھنے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے کہدوں کہ سرمایہ دارانہ سماج میں ہر عورت گھریلو عورت یا بازاری عورت سب کے سب طوائفیں ہیں تو تم تھوڑی دیر کے لئے خوش ہو جاؤ گی۔ تمہاری خوشی میں چار پانچ چاند لگانے کے لئے میں بطور حوالہ انگلستان کے شہرۂ آفاق ادیب جارج برنڈشا کا مقولہ بھی سنا دوں کہ شادی بھی ایک قانونی فحش کاری ہے۔ اقتصادی عدم مساوات کے اس سماج میں عورت کے ساتھ مرد یہی سلوک تو کرتا ہے کسی عورت کو عمر بھر پالنے پوسنے کا ذمہ لے کر پادری یا قاضی یا برہمن کے ذریعے قانون کی مدد لیتا ہے اور کسی عورت کے لئے نہیں — بہر حال کسی عورت کو وُہ ماہوار روپے دیتا ہے کسی کو ایک رات یا چند گھنٹوں کے لئے۔ — گھریلو عورت میں اور بازاری عورت میں فرق اگر کوئی ہے تو وُہ شائد اُنیس بیس کا ہے — بقول راجندر سنگھ بیدی کا شور دونوں جگہ ہوتا ہے۔ مگر گھر میں ذرا کم ہوتا ہے اور بازار میں زیادہ۔

تمہیں تھوڑا اسا خوش کرنے کے بعد میں تمہیں بڑی کام کی باتیں بتانا چاہتا ہوں تم چاہو تو ان باتوں کو اپنی قراردادوں میں شامل کر کے حکومت کے آگے بھی پیش کر سکتی ہو۔ اب جو کوئی بھی تمہیں جلاوطن کرنے آئے — اگر وہ بوڑھا ہو تو اس سے پوچھو۔

"میرے باپ — تم نے ہمیں پیدا کیوں کیا تھا جواب مارنا چاہتے ہو؟"

اگر وہ شادی شدہ ہو تو اس سے یہ پوچھنا

"میرے سرتاج — تم نے مجھے پہلے اپنے گھر سے نکالا کیوں تھا کہ اب میرے بازار میں بیٹھنے کو گوارا نہیں کرتے۔"

اگر وہ نوجوان ہو تو اس سے کہنا:

"میرے بھائی — جب میں بھوکی مر رہی تھی تو میرے نوجوان بھائی کی غیرت کو کیا ہوا تھا کہ وہ پیٹ بھرنے کے بجائے میری جسم فروشی کو گوارا کرتا رہا۔"

اگر وہ کوئی لیڈر یا حکومت کا افسر ہو تو بغیر خوف اور جھجک کے اسے سنا دینا۔

"کہ تم نے ہمیں وطن دیا۔ اب جلاوطن کرتے ہو۔ تم نے ہمیں جنم دیا۔ اب تم ہماری ہستی کو مٹا دینا چاہتے ہو۔ اگر تم صرف حکومت کے علاوہ اپنی رعایا کی معاشی حالت کی طرف توجہ کرتے۔ اگر تم خزانے، جیل خانے اور بنک تعمیر کرنے کے بجائے اپنی رعایا کے گھروں میں بھی جھانک کر دیکھتے۔ ان کے منہ کے نوالے چھینتے رہنے کے بجائے ان پر قحط بنگال بن کر مسلط رہنے کے بجائے، تم ان کے دکھ درد سے واقف ہوتے۔ انہیں زندہ رہنے کا جائز حق دیتے تو عورت ماں، بہن، بیٹی اور بیوی ہی رہتی۔ طوائف لونڈی ایکٹرس

سوسائٹی گرل نہ بن سکتی۔

تم ان سے کہو کہ تم ہمیں فریدیرروڈ سے نکال سکتے ہو مگر تم ہمیں اپنی سوسائٹی سے ہرگز نہیں نکال سکتے۔ تم ہمیں شاہی محلے سے باہر کر سکتے ہو۔ مگر تم ہمیں اپنی گھناؤنی خلوتوں اور اپنی اندھیری راتوں سے کبھی نہیں نکال سکتے۔ اگر تم ہمیں نکالنا ہی چاہتے ہو تو پہلے وہ زمین بدلو جس پر ہم کھڑی ہیں۔ پہلے وہ بیج ضائع کرو جس سے ہم پیدا ہوتے ہیں ـــــ تم ہمیں صرف طوائف کہہ کر آبادی سے باہر نہیں کر سکتے۔ ہمیں ماں، بہن، بیوی یا بیٹی بنا کر اپنے گھر تمہیں بلانا ہی پڑے گا۔

فریدیرروڈ یا شاہی محلے سے طوائف کو نکال دینے سے طوائف نکل نہیں سکتی۔ ایک جگہ اکٹھی کی ہوئی گندگی ساری آبادیوں میں پھیل جائے گی۔ تو کیا اس وقت ساری آبادی کو کہیں نکال پھینکو گے؟

طوائف کی جلاوطنی کا قانون پاس کر دینا بہت آسان ہے۔ طوائف کا وجود مٹانا بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے کوئی قانون نہیں کام آسکتا۔ اس کے لئے سارے نظامِ حیات کو بدلنا پڑے گا۔

تم فتویٰ صادر کرنے والے مولویوں اور قانون نافذ کرنے والے عہدہ داروں سے کہو کہ جب تک ایک اونچے محل کے سائے میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہوگا۔ اس وقت تک طوائف دونوں کے درمیان برابر کھڑی رہے گی ـــــ عورت کو گھر کی چار دیواری سے چوٹی پکڑ کر نکال دینا بہت آسان ہے مگر بازار سے عورت

کو نکالنا بہت مشکل ہے۔ جب تک انسان نواب زادہ اور فقیر زادہ رہے گا۔ اس وقت تک طوائف برابر پیدا ہوتی رہے گی۔

معاف کرنا ڈیئر ——— میں یہاں ذرا جذبات کی رو میں بہہ گیا تھا۔ اس لئے مجھ میں اور خط میں تھوڑی سی تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر اب بغیر تلخی کے کام نہیں چلے گا اپنی مصنوعی میٹھی آواز کو اپنے گلے میں گھونٹ کر اب اصلی اور تلخ آواز میں گیت گاؤ تاکہ دُنیا چونک پڑے

آخر میں ایک اور تلخ مشورہ دیئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ کہ تم نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب سے ملنے کے بجائے بیگم لیاقت علی خاں سے ملو۔ ممکن ہے۔ تم کامیاب ہو جاؤ۔ نواب زادہ صاحب تو بالآخر مرد ہیں۔ اور مرد کے سماج میں عورت تو طوطی ہوتی ہے۔ جس کی آواز...... اب بیگم لیاقت علی خاں ہی تمہارے لئے کچھ کر سکتی ہیں۔ کیونکہ تم اور وُہ ہم جنس ہو۔ عورت ہی عورت کی فریاد سُن سکتی ہے ———

ہمت سے کام لو۔ تم ایک بہت بڑی طاقت ہو۔ تمہارے پاس کون سی قوت نہیں۔ ابروؤں کے کمان، نظروں کے تیر اور ——— اور اٹم بم بھی تو تمہارے پاس ہیں۔ تمہاری پیٹی کوٹ آرمی، تمہاری لہنگا فوج، تمہارا لشکر رنگ و بو جب ایک بار روانہ ہوگا۔ تو پھر کوئی لشکر تمہارے لشکر کے سامنے نہ ٹھیر سکے گا۔

ایک اور تفصیلی خط بعد میں لکھوں گا۔ الماس جان، نگینہ بائی، پکھراج
اور مشتری کو سلام اور عید مبارک کہہ دینا۔ گل بانو بیمار تھی۔ اب کیسی
ہے؟ مجھے اس کی صحت کی بڑی فکر ہے۔ جواب فوراً دینا اور گھر کے پتے
پر ہرگز نہ دینا۔ کہیں خط میری بیوی کے ہاتھ نہ پڑ جائے۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ
بیوی سے میں بہت ڈرتا ہوں۔

اچھا اب خدا حافظ

تمہارا

شیخ باغی خان

مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۴۹ء

اپنی پسند کے ریکارڈ سنئے!

یہ محض ایک سُنی سنائی بات ہے۔ ممکن ہے۔ جھوٹ ہو۔ ممکن ہے سچ ہو۔ یا پھر دونوں نہ ہوں۔ بلکہ ان دونوں کے درمیان کی کوئی چیز ہو۔ مگر یہ بات کسی نہ کسی طرح میرے علم میں آگئی۔ بات چونکہ بڑی انوکھی اور نادر ہے اور میں فطرتاً علم کے معاملے میں بخالت سے کام لینا گناہ سمجھتا ہوں۔ اس لئے آپ کو بتائے دیتا ہوں مگر اس وعدہ اور اس شرط پر کہ یہ بات بالکل راز میں رہے اور سوائے میرے آپ کے اور آل مائٹی خدا کے کسی کو معلوم نہ ہو۔ آپ قسم نہ کھائیں۔ مجھے تو آپ کی شرافت پر پورا پورا اعتماد ہے۔ میں تو بغیر مطالبۂ حلف کے آپ کو بتا رہا ہوں مگر پھر بھی احتیاط رکھئے۔ کیا معلوم بھول کر آپ سے یہ راز فاش ہو جائے اور مجھ جیسا کوئی بدنیت ادیب اخبار میں چھاپ دے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر یہ سمجھئے کہ میرا اور

آپ کا بیڑا غرق۔ اپنا اور میرا بیڑا غرق کرنے کے خیال کو اپنے دل سے بالکل اسی طرح نکال دیجئے۔ جس طرح ہمارے سرمایہ دار لیڈروں نے انگریزی سامراج کو اپنے وطن سے نکال دیا ہے۔ یعنی نکالا بھی ہے اور نہیں بھی نکالا۔

اوہ آپ تو بڑے بیتاب نظر آ رہے ہیں۔ ہاں جی راز کی بات سننے کے لیے آدمی ایسا ہی بیتاب اور بے چین ہوتا ہے۔ کیا آپ نے قدیم یونان کے مشہور بادشاہ قلفاقیل کی وہ کہانی نہیں سُنی جس نے اپنی ملکہ طوطیان کے بارے میں بڑا "پُراسرار راز" سُننے کی بیتابی میں اپنے ہوشمند وزیر فلن فلاف کو قتل کر دیا تھا ــــ راز کی بات ہوتی ہی کچھ ایسی بے تاب گُن ہے کہ کیا بادشاہ کیا فقیر سب بیتاب ہو جاتے ہیں۔ مجھے چونکہ آپ کی بیتابی کا امتحان لینا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ اس لئے اپنا کان قریب لائیے تاکہ میں آپ کو وہ راز کی بات سُنا دوں اور کوئی تیسرا اس کا ثواب حاصل نہ کر سکے۔

ہاں تو جناب وہ راز کی بات یہ ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان اور پاکستان کو آزادی ملی اور دونوں ملکوں کے شہروں میں جشنِ آزادی بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تو آل انڈیا ریڈیو سے آپ کی فرمائش کے پروگرام میں ہمارے سیاسی لیڈروں کی پسند کے ریکارڈ پیش کئے گئے۔ راوی نے اس دلچسپ پروگرام کی تفصیل یوں بتائی ہے کہ پندرہ اگست کی رات کے دس بجے آپ کی فرمائش کے عنوان سے یہ پہلا ریکارڈ پنڈت جواہر لال نہرو کا بجایا گیا جو یہ تھا۔

"دُور ہٹو! دُور ہٹو اے دُنیا والو ہندوستان ہمارا ہے۔"

مسز وجے لکشمی کی پسند کا ریکارڈ تھا۔

"میرے بھیا نے پہنا ہے تاج رے۔"

نواب زادہ لیاقت علی خاں کی پسند کا ریکارڈ تھا۔

"توحید کے پرچم کو جب غازی اُٹھالیں گے۔"

اور اس کے بعد لارڈ مونٹ بیٹن کی پسند کا ریکارڈ بڑے اہتمام سے بجایا گیا

"آئی آئی مصیبت آئی۔ مسافر بھاگ چلو۔"

نظام حیدرآباد کی پسند کا ریکارڈ۔

"جب تم ہی چلے پردیس لگا کر ٹھیس، او پریتم پیارا
دُنیا میں کون ہمارا

سردار ولبھ بھائی پٹیل کی پسند کا ریکارڈ۔

"اے دُور جانے والے وعدہ نہ بھول جانا"

سیٹھ برلا کی پسند کا ریکارڈ

"او جانے والے بالموا
لوٹ کے آ لوٹ کے آ"

سیٹھ اصفہانی کی پسند کا ریکارڈ

"اک بار پھر سے آجا —— آجا

دل میں مرے سما جا"

سارے مہاراجگان اور مہارانیوں کی پسند کا ریکارڈ

"دن خوشی کا چھپ گیا، رات غم کی آگئی"

پورن چند جوشی کی پسند کا ریکارڈ

"مزدوری ہی بدلے گا تقدیر جہاں ساتھی"

سجّاد ظہیر کی پسند کا ریکارڈ

"اب لے کے لال جھنڈا بھیّا آگے بڑھتے جانا
سر کٹتا ہے تو کٹ جائے جھنڈا نہ جھکانا
او۔ او جھنڈا نہ جھکانا"

اور سب سے آخر میں انڈین کرسچین سوسائٹی کی صدر میڈم فیلڈن کی پسند کا ریکارڈ بجایا گیا۔

"وہ اپنی یاد دلانے کو اک عشق کی دنیا چھوڑ گئے"

ممکن ہے کہ یہ راز کی بات آپ کو بالکل سفید جھوٹ اور محض گپ نظر آئے اور اور ہر عقل مند اور ذی ہوش انسان کو یہ راز کی بات جھوٹ کے سوائے اور کیا معلوم ہو سکے گی۔ چنانچہ مجھے یہ بات نہ صرف سفید بلکہ رنگ برنگا جھوٹ نظر آتی۔ بھلا کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے لیڈر پختہ عقل اور پختہ مغز لیڈر اسکول کی لڑکیاں

اور لڑکوں کی طرح "فرمائشی پروگرام" میں حصہ لیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہرگز نہیں ہوا اور آئندہ بھی ہرگز نہ ہوگا۔

ہاں! البتہ ریڈیو پر فرمائشی پروگرام پہلے کی طرح ہمیشہ ہوتے رہیں گے۔ اور زندہ دل نوجوان عورتیں بچے اور بوڑھے ہر ہفتہ اپنی اپنی پسند کے ریکارڈ سنا کرینگے جو مر جائیں گے اور جو زندہ رہیں گے۔ وُہ برابر سُنتے رہیں گے۔

مرنے والے نہ سُنیں یا جینے والے سُنیں۔ ان دونوں باتوں کا اصل پروگرام پر قطعاً کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ پاکستان اور ہندوستان کی ساری نشرگاہوں سے یہ واحد پروگرام ایسا ہوتا ہے۔ جسے ہر طبقہ اور ہر عمر اور ہر مزاج اور ہر قومیت اور ہر مذہب اور ہر رنگ اور ہر نسل کا آدمی بڑے شوق سے سُنتا ہے اور سر دھنتا ہے یعنی بہت پسند کرتا ہے۔

بعض بیکار فلسفیوں نے اس پروگرام کے سُننے والوں کے نفسیاتی تجربوں کی ایک مہم جاری کر رکھی ہے۔ جس طرح علم شناخت کے ماہرین کسی انسان کے چہرے مہرے حرکات سکنات رہن سہن، بول چال، طرزِ تحریر اور دستخط سے اس کا کردار معلوم کر لیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح بعض ماہرین علوم غیب کی پسند کا ریکارڈ سُن کر بھی اس کے کردار اور شخصی زندگی کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر سکتے ہیں۔

میرے ایک دوست مسٹر فرید احمد فاروقی اس غایت کو پیشِ نظر اور پسِ ذہن رکھ کر ہر ہفتہ ریکارڈوں کا فرمائشی پروگرام سُنا کرتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان

اور پاکستان کی ساری نشرگاہوں کے فرمائشی پروگراموں کے بارے میں ایک چارٹ تیار کیا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ دونوں ملکوں میں لوگوں کی داخلی زندگی کا کیا کردار ہے۔ چنانچہ تازہ ترین سال کا تازہ ترین ریکارڈ یہ ہے۔

سال	ریڈیو اسٹیشن	فرمائش کرنے والے
۱۹۴۸ء	۱۲ عدد	۱۲۰۰۰

اب ان بارہ ہزار فرمایش کرنے والوں کی تقسیم ان کے ذہنی رجحانات و کیفیات کے ماتحت یہ ہے:۔

۸۰۰۰	نے محبّت کا آغاز کیا ہے
۱۰۰۰	محبّت کر رہے ہیں
۲۰۰۰	محبّت میں ناکام ہو چکے ہیں
۲۰۰	شرابی
۱۰۰	طوائفیں
۳۰۰	بے فکرے
۲۰۰	تاجر پیشہ لوگ
۱۰۰	والدین
۱۰۰	خدا ترس مذہبی لوگ

میرے ایک ملاقاتی جن کا نام سید لطف علی ہے اور جن کے نام کا انگریزی

توجمہ سید بلپیشر علی ہے۔ جو بہت ہی کالے بہت ہی موٹے اور بہت ہی بلیے ہیں۔
چونکہ ہیں سید لطف علی اس لئے بغیر لطف یعنی فرمائشی پروگرام کے زندہ نہیں رہ سکتے
جس نشر گاہ سے فرمائشی پروگرام ہو۔ اس وقت اپنا اہم سے اہم کام چھوڑ کر ریڈیو
سٹ کے پاس جم کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کے پیچھے بھی ایک راز ہے۔ جو کل تین
بجے بلکہ پونے چار بجے شام مجھے ان کے ایک دوست نے بتایا ــــ راز دار کیا۔
ایک عام سی بات ہے کہ سید لطف علی صاحب کو اپنی خالہ زاد لڑکی آنسہ ساجدہ سے
الفت ہو گئی ہے اور چونکہ لطف علی صاحب کی والدہ اور ساجدہ کی والدہ میں
شدید لڑائی ہے۔ اس لئے لطف علی صاحب ساجدہ کے گھر یا ساجدہ لطف علی
کے گھر آجا نہیں سکتی۔ بلکہ ان کا پرندہ اس کے گھر یا اس کا پرندہ ان کے گھر پر
پر نہیں مار سکتا۔ اب واردات قلبی یا ماجرائے دردِ دل ایک دوسرے کو سنانے
کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے۔ اور وہ ہے ریڈیو کا فرمائشی پروگرام۔

چنانچہ ایک ہفتہ سید لطف علی کی پسند کا ریکارڈ فلاں اسٹیشن سے بجایا گیا

تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا

ساجدہ بڑی ذہین لڑکی ہے۔ چنانچہ وہ سمجھ گئی کہ سید لطف علی کا وہ "تم"
کون ہے۔ اس لئے اس نے لطف علی سے پہلی ملاقات اور ان کی پہلی نظر
کے تاثرات کے اظہار کے لئے دوسرے ہفتہ کے فرمائشی پروگرام سے یہ
ریکارڈ بجوایا۔

لگا پہلی نظر کا تیر رے

اللہ۔ پہلی نظر کا تیر

تیسرے ہفتہ لطف علی کا ریکارڈ بجا

ذرا جلوہ جس نے دیکھا

دیوانہ ہو گیا۔ مستانہ ہو گیا

چوتھے ہفتے ساجدہ کی فرمایش یوں پوری ہوئی ہے

میں ان کی بنجاروں رے میں ان کی بنجاروں رے

پانچواں ہفتہ لطف علی نے شبہ کو یقین میں بدلنا چاہا۔

کہیں دھوکہ نہ دینا ہمیں

نہ افسانہ ہم کو سنانا

چھٹے ہفتے ساجدہ نے یقین دلایا

یہ افسانہ نہیں ظالم مرے دل کی حقیقت ہے

مجھے تم سے محبت ہے، مجھے تم سے محبت ہے

ساتویں ہفتہ لطف علی کو یقین آ گیا اور انہوں نے اعلان کر دیا۔

ہم تمہارے ہو چکے

تم ہمارے ہو نہ ہو

آٹھویں ہفتہ ساجدہ نے وعدہ لینا چاہا

دل دھڑکے، آنکھ موری پھڑکے
چلے جانا نہ دیکھو جی جھپ ڑکے

نویں ہفتے لطف علی نے وعدہ وعید کی اس فضول بحث میں پڑنے کی بجائے محبت کئے جانے اور کئے جاتے رہنے کا مشورہ دیا کہ محبت ہی عین حیات ہے۔

محبت کی بندی محبت کئے جا

مگر ساجدہ آخر کو عورت ذات تھی، اس نے دسویں ہفتے انہیں اس طرح دعوتِ ملاقات دی تاکہ معاملہ پختہ ہو جائے۔

"ہماری گلی آنا، اچھا جی!"

چنانچہ گیارھویں ہفتے لطف علی نے اپنا سابقہ سکونتی مکان تبدیل کر کے ساجدہ کو اطلاع دی۔

"گھر ہم نے لے لیا ہے ترے گھر کے سامنے"

مگر ان کی خالہ کو جیسے ہی لطف علی کی اس "حرکتِ ناہنجار" کا پتہ چلا تو اس نے اپنی ساجدہ کو مکان کے پچھواڑے کے ایک کمرے میں یعنی (CELL) سیل میں ڈال دیا۔ اب تین چار ہفتوں تک میر لطف علی کی پسند کے حسب ذیل ریکارڈ بجتے رہے۔

۱۔ اُٹھ سجنی کھول کواڑے
ترا ساجن آیا دوارے

۲۔ دُنیا میری جواں ہے

آباد تو کہاں ہے

آ رات جا رہی ہے

۳۔ ہائے کس بُت کی محبت میں گرفتار ہوئے

۴۔ ورانیوں سے نینا ملائے جاؤ رے

مورے بانکے رسیلے سنوریا

مگر صد حیف اور ہزار افسوس کہ ساری اطلاعیں اور التجائیں صرف ہو کر رہ گئیں۔ ادھر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کے سولھویں ہفتے غیر متوقع طور پر ساجدہ کی پسند کا ایک ریکارڈ بجا۔"

ساسوں کے گھر سے آئی ہیں۔ ہاں آئی ہیں

موری سونے کی چوڑیاں

اب لطف علی کو پتہ چلا کہ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے یعنی ساجدہ کی شادی طے پائی ہے اور وہ بھی کسی امیر آدمی کے ساتھ جس کی ماں نے دلہن کے لئے سونے کی چوڑیاں بھیجی ہیں۔

لطف علی صاحب کو بڑا غصہ آیا اور انہوں نے سترھویں ہفتہ اس ریکارڈ کی فرمائش کر دی۔

یہاں بدلا وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے

ساجدہ نے اٹھارھویں ہفتہ اس ریکارڈ کے ذریعہ صورت حال سے آگاہ کیا۔"

مجبور ہوں میں عورت ہوں

بولو ساجن کیا کروں کیا کروں

لطف علی نے اس ریکارڈ کے ذریعہ مشورہ دیا۔

مار کٹاری مر جانا

پی کے زہر مر جانا

ساجدہ دو ہفتے تک اس مشورہ پر غور کرتی رہی اور لطف علی صاحب کو یقین آگیا کہ یا تو کٹاری چل گئی یا زہر اپنا کام کر گیا لیکن بائیسویں ہفتہ ساجدہ کی ہمراز سہیلی سلطانہ کی پسند کا ریکارڈ بجایا گیا۔

گوری چلی پیا کے دیس

یعنی معاملہ بقول پنجابیوں کے "گڑ چ" ہو گیا۔ یعنی ساجدہ کی شادی خانہ آبادی بخیر و خوبی انجام پا گئی اور ساجدہ اب پیا کے دیس جا رہی ہے اور اب سامنے بیابان ہی بیابان ہے۔

لطف علی نے تیئسویں ہفتہ اپنا یہ ریکارڈ لگایا۔

محمل کو ذرا روکو، سن لو مرا افسانہ

چوبیسویں ہفتے ساجدہ نے تلقین صبر کی یعنی

محمل نہیں رک سکتا، اب صبر کرو پیارے

پچیسویں ہفتہ لطف علی کا آخری فرمائشی ریکارڈ بجا۔

اے کاتبِ تقدیر مجھے اتنا بتا دے

چھبیسویں ہفتے ساجدہ بیگم کا آخری فرمائشی ریکارڈ لطف علی صاحب کو یہ پیغامِ جدائی دے گیا۔

ہمیں تو شامِ غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی

یہ تو تھی سید لطف علے اور ساجدہ بیگم کی ریڈیائی محبت کی پُربہار ہفتوں والی داستان۔ آج کل سید لطف علی اور ساجدہ بیگم کی دونوں کی زندگیاں بڑی تلخ غم آلود اور اُداس ہیں مگر اس کے باوجود اب بھی ریکارڈوں کا فرمائشی پروگرام ہی ان کے زخموں پہ مرہم اور نمک چھڑکتا ہے۔ کبھی کسی پروگرام میں ریکارڈ بجتے ہیں۔

۱۔ دو دلوں کو یہ دُنیا ملنے ہی نہیں دیتی

۲۔ چاہ برباد کرے گی ہمیں معلوم نہ تھا

۳۔ پہلے جو محبت سے انکار کیا ہوتا

۴۔ ہائے ہائے یہ ظالم زمانہ

تو ان دونوں کشتگانِ رہِ اُلفت کے دلوں سے ٹھنڈی آہیں نکلتی ہیں۔ اور اس طرح صبح ہوتی ہے۔ شام ہوتی ہے۔ اسی طرح ساجدہ کسی دن مرجائے گی اور کسی دن سید لطف علی مرجائیں گے اور دُنیا سے ایک فرہاد اور ایک شیریں کم ہوجائیں گے۔ مگر ریڈیو بجتا ہی رہے گا اور ہر جمعرات دس بجے شب اناؤنسر اعلان دیں گے۔

"آپ کی پسند"

آپ کی پسند کے پروگرام کے سلسلہ میں فرمائش کرنے والی یا کرنے والوں کے کرداروں کے نفسیاتی تجزیوں کے بارے میں میں نے ابھی ایک ہلکا سا اشارہ کیا تھا کہ بیچ میں سید لطف علی صاحب ٹپک پڑے۔ اس لئے بات جہاں کی تہاں رہ گئی تھی۔ اب جبکہ سید صاحب موصوف تشریف لے جا چکے ہیں۔ اس لئے میں اشارے اشارے کو واضح طور پر واضح کر دینا چاہتا ہوں (کہ یہ میرا قومی فرض ہے) میرے دوست فرید احمد فاروقی جن سے میں ابھی ابھی آپ کو ملا چکا ہوں۔ وہ آج کل ایسے ہی نفسیاتی تجزیوں میں بُری طرح شب و روز مصروف ہیں۔ اتنے مصروف کہ صرف کبھی سر کھجانے کی فرصت ملتی ہے۔ ان کی تازہ ترین کتاب "ریڈیو کی فرمائشی موسیقی کی نفسیات" جلد اوّل سے تجربات اخذ کر کے پبلک کے فائدے کے لئے یہاں درج کرتا ہوں۔ بلکہ اس سے پہلے تو میں آپ کو اس کتاب کا صفحہ ۵۲ دکھاتا ہوں جو اس کتاب کی جان ہے۔ صفحہ ۵۲ پر فرید صاحب نے بڑے دلچسپ خط کا عکس شائع کیا ہے وہ خط قارئین اور ناظرین دونوں کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ ذیل میں ہو بہو لفظ بہ لفظ نقل کیا ہے۔ گستاخی معاف اور مخفی مبادکہ یہ خط کسی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر کے نام لکھا گیا تھا جسے فرید صاحب نے حاصل فرمایا اور باجازت ریڈیو اسٹیشن لنڈی کوتل شائع کیا۔

وہ خط یہ ہے:-

از لاہور۔ گوالمنڈی ۔ مورخہ ۱۱ر دسمبر

جناب منیجر صاحب ریڈیو اسٹیشن لنڈی کوتل

بعد دعا سلام و تسلیمات واضح ہو کہ ہم تم یہاں خیریت سے رہ کر آپ کی خیریت بدرگاہ الٰہی نیک چاہتے ہیں۔ دیگر کیفیت یہ ہے کہ ہم حسب ذیل تابعدار لوگوں کی فرمائش کے مندرجہ ذیل ریکارڈ ریڈیو پر بجائیں تو ہم جمعرات کی رات دس بجے اپنے محمد خواجہ صاحب امرتسری کی ہوٹل خوش لذیذ ہوٹل میں بیٹھ کر سنیں گے اور آپ کے اور آپ کے بال بچوں کے حق میں دعا گو رہیں گے۔

اب نمبرواری فرمائشات درج ہیں

۱۔ میری فرمائش

دھیرے چل دھیرے چل او تانگے والے دھیرے چل

۲۔ چراغ دین حلوائی کی فرمائش

دہی والی ہماری گلی آئیو۔

۳۔ کریم خاں بمبئی والے ٹیلر ماسٹر کی فرمائش

میں تو بمبئی سے دلہن لایا رے۔

۴۔ کھلونے والے بابو خاں کی پسند

یہ جگ ہے گڑیوں کا کھیل

۵۔ پہلوان قادر بخش کی فرمائش

آنا میری جان سنڈے کے سنڈے

اور اپنا ناچنے والا بھاٹیا بھی ریکارڈ سننے کا شوق رکھتا ہے۔ اس کا یہ ریکارڈ بجے گا۔

چنا جور گرم بابو میں لایا مزے دار

اور رام گوپال ملز کا مزدور بھائی بولتا ہے۔ یہ ریکارڈ لگاؤ

کیوں خون غریبوں کا بہاتی ہے امیری

اور یہ خواجہ صاحب کے ہوٹل کا چھوکرا شیرا بولتا ہے اس ریکارڈ کے بارے میں۔

کیا جانے امیری جو غریبی میں مزا ہے

بہت فرمائشات ہو گئی ہیں مگر ہمارے استاد فتو خاں کا لونڈا مجو بہت ضد کر رہا ہے کہ اس کی پسند کے ریکارڈ کے لئے بھی دو چار حروف آپ کو لکھا دوں۔ ہم نے اسے بہت سمجھایا کہ منیجر صاحب بیچارے بڑے آدمی ہیں وہ تجھ جیسے لونڈے کی فرمائش کیسے پوری کریں گے۔ وہ مانتا ہی نہیں ہے۔ چلئے جی اس کی پسند کا بھی ریکارڈ بجا ہی دیجئے۔ بچہ آدمی ہے خوش ہو جائے گا اور آپ کے بچوں کو دعا دے گا۔ الغرض اُس کی پسند کا یہ ریکارڈ ہے۔

بوٹ کروں میں پالش بابا بوٹ کروں میں پالش

اچھا جی منیجر صاحب اتنی سی فرمائشیں ہیں۔ آئندہ اور بھی کی جائیں گی۔ جب تک

آپ سلامت ہم سلامت تو پھر ریڈیو اسٹیشن بھی سلامت۔ اس جمعرات کو ہم سب یار دوست خواجہ صاحب کی ہوٹل میں ضرور جمع ہوں گے اور اپنا اپنا نام اور اپنا اپنا ریکارڈ سننے کے لئے بیتاب رہیں گے۔

ہماری طرف سے وہ ریکارڈ لگانے والے بھیا جی کو بہت بہت سلام دعا اور آپ کو جزائے خیر اور نیک توفیق۔ فقط

آپ کا تابعدار۔ سردار محمد

تانگہ والا تانگہ نمبر (۷۱۶) گوالمنڈی چوک لاہور شہر

نوٹ:۔ خط کے جواب کے لئے چار پائی بھیج رہا ہوں۔ جواب ضرور دیں اور کارلائقہ سے یاد فرمائیں۔

اس دلچسپ خیطے کو جو خط بھی ہے اور نفسیاتی تجزیوں کا ایک مجموعہ بھی۔ بغیر تنقید و تبصرہ کے ویسے ہی چھوڑ کر فاضل مصنف نے دوسرے نفسیاتی تجزیوں کے حسب ذیل نتائج پیش کئے ہیں۔ صفحہ ۴۸ پر وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"میرٹھ کی مسماۃ رادھا کماری غالباً نوشگفتہ جوانی ہے۔ اس نے آل انڈیا ریڈیو نمبر ۱۰ سے بتاریخ ۸ جولائی اور بتاریخ ۱۲ اکتوبر حسب ذیل ریکارڈوں کی فرمائش کی۔

"جیا لہرائے۔ آئی جوانی"

"کر لو محبت۔ کر لو محبت"

لڑکی بہت ہی نوعمر اور ناتجربہ کار معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتی کہ محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے اور پھر محبت کوئی سرجیکل آپریشن تو نہیں ہے کہ کی جائے۔

دوسرا تجزیہ ۲۴ مارچ کے پروگرام میں کسی محمد سلطان کی پسند کا یہ ریکارڈ بجایا گیا تھا۔

"جیون آشا یہ ہے میری"

"نام ہے اس کا دوانی۔ سارا خزانہ یہ ہے"

اس ریکارڈ کے بول سے شخصیت یوں واضح ہوتی ہے کہ یا تو وہ کوئی بے روزگار گریجویٹ ہے یا مشرقی پنجاب کا مہاجر جس کے پاس صرف ایک دوانی رہ گئی ہے

تیسرا تجزیہ:

۸ جنوری کو آل انڈیا ریڈیو نمبر ۲ سے کسی فہمیدہ خاتون نے آگرہ سے فرمائش کی تھی:۔

"ابھی تو میں جوان ہوں"

یہ فہمیدہ خاتون غالباً کوئی نوجوان بیوہ ہے جس کے خیالات کی ترجمانی اس ریکارڈ نے کی۔ وہ غالباً عقدِ مکرر یا نکاح ثانی کی خواہشمند ہے۔

چوتھا تجزیہ:۔

پچھلے ہفتہ فلاں ریڈیو اسٹیشن سے کسی گلاب بائی کی پسند کا یہ ریکارڈ بجایا گیا

"مور جوبنا کا دیکھو اُبھار
پاپی جوبنا کا دیکھو اُبھار"

یہ گلاب بائی ضرور کوئی عصمت فروش عورت ہے اور ریڈیو کے فرمائشی پروگرام کو ذریعہ اشتہار کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے۔ اوّل تو یہ ریکارڈ ہی بڑا فحش ہے۔ چاہے اس کا گیت حضرت جوش ملیح آبادی کے فکر کا نتیجہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ تو بالکل مخرب اخلاق کسی ریڈیو اسٹیشن سے اس ریکارڈ کو نہ بجنا چاہئے اور نہ کسی ریڈیو کو کسی ایک شخص کا ذاتی پروپیگنڈہ کرنا چاہئے۔

پانچواں تجزیہ :-

پانچواں تجزیہ سیاسی رنگ کا حامل ہے۔ ۱۵ اگست ۴۷ء کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے ہر ریڈیو اسٹیشن سے متعدد بار متعدد لوگوں کی فرمائش پہ بجایا گیا۔ اور وہ ریکارڈ یہ تھا۔

"جب ہم یہاں اور تم وہاں
کیسے بجے گی بانسری"

اس ریکارڈ کی فرمائش میں کسی شخص واحد یا صرف دو اشخاص کی داستانِ جدائی مضمر نہیں بلکہ دو ملکوں، دو قوموں، دو تہذیبوں اور دو محبتوں کی جدائی کی داستان ہے اور یہ ریکارڈ عرصۂ دراز تک ہدفِ فرمائش بنا رہے گا۔ جب تک دونوں ممالک کے مابین دونوں قوموں کے مابین خوشگوار تعلقات نہیں ہو جاتے۔ جب تک نفرت کی

جگہ محبت نہیں لے لیتی۔ دونوں ممالک کے غریب عوام اپنے لیڈروں سے پوچھتے رہیں گے بولو

"کیسے بجے گی بانسری"

انگریزوں اور دیسی سرمایہ داروں نے وہ بانسری توڑ ڈالی اور نغمہ کو مار ڈالا۔ اب نغمہ مر چکا ہے۔ مگر اگر دونوں ملکوں کے عوام جاگ اٹھیں۔ دونوں ملکوں کے عوام انسانیت کا پرچم لے کر آگے بڑھیں تو ممکن ہے کہ بانسری بانسری کا چھٹا ہوا نغمہ واپس مل جائے، پھر نغمہ جاگ اٹھے۔ پھر زندہ ہو جائے۔ پھر ہماری روحوں میں گونجنے لگے۔ پھر عوامی ہندوستان اور عوامی پاکستان جنم لیں گے۔ اس وقت فرمائشی پروگرام میں کیسے کیسے ریکارڈ بجیں گے۔ ہائے ہائے کچھ نہ پوچھو۔

ریڈیو پر فرمائشی پروگرام سننے والوں کے نفسیاتی تجزیوں پر یہ کتاب مصنفہ فرید احمد فاروقی بڑی جامع بڑی مدلل اور بڑی "وہ" ہے۔ کم از کم اردو ادب میں اس سے پہلے اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ کتابیں لکھنے والوں نے یوں تو "استاد باورچی خانہ"۔ "فن مرغ بازی"۔ "رہبر ہارمونیم"۔ "بدکردشیا استانی"۔ جیسی معرکۃ آلارا کتابیں لکھی ہیں، مگر یہ کتاب تو بس چیزے دیگری" ہے۔ اس موضوع پر تصنیف کرنے کا سہرا مسٹر فرید احمد فاروقی کے سر پر ان کی شادی کے سہرے سے بھی پہلے باندھا گیا تھا۔ کتاب آپ کے شہر کے ہر کتب فروش کے پاس مل سکتی تھی مگر افسوس کہ پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت سارا اسٹاک ضبط کر لیا گیا۔ پھر بھی ہم

مسٹر فرید احمد فاروقی کی خدمت میں ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بدنصیب ملک میں بعض ایسے بھی لوگ ہیں۔ جن کے فرمایشی ریکارڈ کا اُن کے شخصی کردار سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً ابھی پچھلے ہفتہ مالیر کوٹلہ ریڈیو اسٹیشن سے آپ کی پسند کے پروگرام میں کسی مسٹر ابراہیم جلبیس بی اے علیگ کی پسند کا یہ ریکارڈ بجایا گیا۔

سجنی کی خیر مائی بابا کی خیر تیرا اللہ نگہباں ہو

تیرا اللہ نگہباں ہو۔ ترا مولیٰ نگہباں ہو

سجنی کی خیر مائی بابا کی خیر

اور تمت بالخیر

نوٹ :۔ مضمون تمام ہوا۔ مصنف بصد عجز و انکساری قارئین سے گزارش کرتا ہے کہ جو بھی صاحب اس مضمون کا ترجمہ سنسکرت اور لاطینی زبان میں کرنا چاہیں۔ وہ مصنف سے پہلے سنسکرت اور لاطینی زبان سیکھ لیں۔ ورنہ ترجمہ مسروقہ سمجھا جائے گا۔

پھر نوٹ :۔ یہ مضمون باجازت ریڈیو اسٹیشن مالیر کوٹلہ عنقریب براڈ کاسٹ ہوگا۔

اور پھر ایک نوٹ :۔ اس مضمون کی تیاری میں بے شمار فلمی گانوں کی ایک آنہ ایڈیشن والی سیریز سے (جو ہر سینما ہال کے باہر ہر شو کے ختم کے

بعد ہر بک سیلر لونڈے سے بآسانی دستیاب ہو سکتی ہے) بے تحاشا مدد لی گئی ہے۔

آخری نوٹ :۔ مضمون پڑھ کر مدیر رسالہ کی معرفت خاکسار مصنّف کو تعریفی خطوط لکھے جائیں۔ تاکہ یہ خاکسار مصنّف خوش رہے اور آئندہ ہفتے کے فرمائشی پروگرام میں یہ ریکارڈ لگوائے :۔

"ہم سے خوش ہے زمانہ

آں آں ......"

آج شب کو پردۂ سیمیں پر

میری زندگی کی سب سے بڑی حسرت یہ ہے کہ میں کوئی نئی فلم دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ کوئی سخن سازی نہیں ہے بلکہ امرِ واقعہ ہے کہ پچھلے دس سال سے میرے دل میں یہ حسرت کچھ ایسی اِس بس گئی ہے کہ اگر آپ میرا سینہ چیر کر دیکھیں تو آپ کو میرا دل نہیں ملے گا بلکہ صرف حسرت ملے گی۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے دس سال سے میں ایک ہی فلم بار بار دیکھ رہا ہوں۔ ان میں نیا پن اگر کچھ ہوتا ہے تو نام کا صرف نام کا۔ وہی ایک فلم جسے میں دس سال سے دیکھ رہا ہوں۔ اُس کا نام کبھی حسن بنارہ ہے تو کبھی قسمت۔ کبھی رتن ہے تو کبھی چھمیاں۔ ہیرو کبھی اشوک کمار ہوتا ہے تو کبھی کے ایل سہگل۔ اور کبھی موتی لال ہوتا ہے تو کبھی پرتھوی راج۔ ہیروئن کبھی پری چہرہ نسیم

ہوتی ہے تو کبھی پُر اسرار بینا۔ کبھی حور شمائل وینا ہیروئن بن کر پردۂ سیمیں پر جلوہ فگن ہوتی
ہے۔ کبھی آہو چشم مہتاب ہیروئن کا روپ دھارے نظر آتی ہے۔ کبھی سدا بہار خورشید
ہیروئن بنتی نظر آتی ہے تو کبھی بلبل بنگال کانن بالا ہیروئن کا رول انجام دیتی ہے۔
مگر فلم وہی ہے — وہی پرانی فلم — وہی کہانی — ایک نوجوان لڑکا ایک نوجوان
لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک رقیب حائل ہو جاتا ہے
رقیب فلم کے آخری سین تک عاشق و معشوق کو تنگ کرتا ہے اور آخری سین میں اپنی
شادی کے سارے انتظامات طے کر کے اپنی جگہ اصلی عاشق کو بٹھا کر خود اوورکوٹ
پہن سگریٹ پیتا ہوا جنگل کی سمت نکل جاتا ہے۔ ہیروئن دولھا کی جگہ اپنے اصلی
عاشق کو دیکھ کر گھونگٹ کے اندر شرماتی ہے لجاتی ہے اور ہم آپ سینما ہال کے
باہر گھر جانے کے لئے تانگہ یا ٹیکسی تلاش کرتے ہیں۔

دوسری خاص خصوصیت جو سارے فلموں کی جان ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ غریب اور
امیر کی لڑائی —— یا افلاس اور امارت کی ٹکر —— شروع سے آخر تک یہ لڑائی یا
یہ ٹکر جاری رہتی ہے۔ آخر میں غریب اور اُس کی غریبی کی فتح ہوتی ہے اور امیر کو
شکست ہوتی ہے۔ وہ ذلیل ہوتا ہے۔ سینما ہال کی پبلک استہزائی سیٹیاں اور طنزیہ
قہقہے سنتا ہے۔ اُن کی گالیاں کھاتا ہے اور پردۂ سیمیں سر پہ پیر رکھ کر یا پیر پہ سر
رکھ کر بھاگ جاتا ہے۔ بقول میر ے

رومانوی فلمیں

گزشتہ دس سال سے پردہ سیمیں پر جو فلمیں پیش کی جا رہی ہیں۔ اُن میں بیشتر فلمیں رومانوی ہوتی ہیں یعنی عشق و محبت کی (LOVE) کہانیاں جو عموماً حسب ذیل طریقوں سے شروع ہوتی ہیں۔ آئیے اپنے شہر کے سینما ہال میں کچھ دیر بیٹھیں۔ سینما ہال کے آپریٹر نے ٹھیک ساڑھے چھ بجے ہال میں اندھیرا پھیلا دیا۔۔۔ وہ اندھیرا جو عاشقوں کے شبِ ہجر کی طرح تاریک ہے جو شبِ دیجور کی طرح بھیانک ہے۔ مگر اچانک اس اندھیرے میں آپ کے سروں پر جیسے رنگ و نور کا ایک "خطِ قزح" تن جاتا ہے اور آپ پردہ سیمیں پر کچھ دیر تک شہر کے مشہور درزیوں، بسکٹ فیکٹریوں اور عطائی حکیموں، محکمہ رسد اور میونسپلٹی کی آیتوں، حسن بخش صابونوں، ترقی پسند کتابوں، خوشبودار تیلوں، بونافائیڈ بھی ہوں، ہر قسم کے سگریٹوں اور آنے والی فلموں کے رنگ برنگے سلائیڈ دیکھتے ہیں پھر اس کے بعد معاً موسیقی کے سُر بلند ہوتے ہیں اور پردہ سیمیں پر ہندوستانی فلم کا انگریزی نام یوں نمودار ہوتا ہے۔

اٹ از اے نٹ کھٹ آرٹ کنسرنس پکچر

چھبیس چھری فرف آف جان پری

سٹوری اینڈ ڈائیلاگ بانی جاہل ہوشیارپوری

فوٹوگرافی	بائی	بی این گھاڈگے
میوزک	بائی	آر۔ بی۔ باٹلے

ڈائریکٹر

بابو رام میڈھے

فلم اگر شہری زندگی سے متعلق ہو تو یوں شروع ہوتی ہے

ایک بہت بڑے شہر کی بہت بڑی شاہراہ۔ موٹروں۔ بسوں۔ ٹراموں، وکٹوریہ گاڑیوں اور آدمیوں کا ایک سیلِ رواں ہے جو بہا جا رہا ہے۔ اس ہجوم میں آپ کو ایک جگہ لیلا چٹنس بھی نظر آتی ہے۔ جو بڑی زرق برق ساڑھی پہنے سڑک پر سے چلی جا رہی ہے۔

اچانک پیچھے سے ایک تیز موٹر آتی نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ہال میں بیٹھے ہوئے سارے تماشائیوں کو روندکر نکل جائے گی۔ لیکن چونکہ وہ فلمی موٹر ہے۔ اس لئے صرف لیلا چٹنس کو روندنا چاہتی ہے۔ آپ کو نہیں۔ پھر اچانک موٹر لیلا چٹنس کے قریب آجاتی ہے۔ لیلا چٹنس گھبرا کر اس زور کی چیخ مارتی ہے کہ ہال میں بیٹھے ہوئے سارے تماشائیوں کے کلیجے دہل جاتے ہیں اور تماشابین عورتیں تو ڈر کر آنکھیں میچ لیتی ہیں اور سارے ہال میں ایک تحسین آفریں سناٹا چھا جاتا ہے ــــــ مگر صاحب جب تک اشوک کمار خٹ یا تھو پر کھڑا ہے۔ کیا مجال ہے۔ کہ اس فلمی موٹر کی جو وہ لیلا چٹنس کو کوئی گزند پہنچائے یا نظر بد سے دیکھے ــــــ

ڈائریکٹر اشوک کمار کی پیٹھ میں ایک ٹھونکا دیتا ہے اور اشوک کمار بجلی کی طرح کوندتا ہے اور لیلا چٹنس کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتا ہے۔ بیچاری فلمی موٹر ناکام و نامراد غصے سے غراتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ تماشا بین عورتوں کی جان میں جان آتی ہے اور مرد تماشائی خوشی سے زور زور کی تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ لیکن لیلا چٹنس چونکہ بیہوش ہے پبلک کی اس مسرت بردوش شور و غوغے سے لطف اندوز نہیں ہو سکتی۔ وہ اشوک کمار کے بازوؤں پر ایسے آرام سے اور بے تکلف انداز سے لیٹی ہے جیسے اپنے بڈروم کے پلنگ پر۔۔۔۔ اسی لئے وہ کروٹ لینا چاہتی ہے۔ لیکن اشوک کمار کی باہیں کوئی سچ مچ کا پلنگ تو نہیں ہیں۔ کہ لیلا چٹنس کروٹ لے سکے۔ چنانچہ کروٹ لینے کی کوشش میں اس کی آنکھ کھل جاتی ہے اور جب آنکھ کھل جاتی ہے تو لیلا چٹنس اپنی چشم میگوں اور میگسار سے مشاہدہ کرتی ہے۔ زبان تو نہیں البتہ سود ہے۔ یعنی وہ ایک نوجوان کی بانہوں میں ہے۔ لیلا چٹنس مسرت سے پوچھتی ہے۔

"تم نے میری جان بچائی ہے۔ نوجوان تم کون ہو؟"

اشوک کمار انتہائی سادگی سے شرمیلا انداز میں جواب دیتا ہے "شامو!"

یہ سادگی، یہ شرمیلا انداز اور یہ پیارا پیارا سا نام سب مل کر محبت کا تیر بن جاتے ہیں اور وہ تیر لیلا چٹنس کے ننھے سے دل میں ترازو ہو جاتا ہے۔ یعنی عام محبوباؤں کی طرح لیلا چٹنس کی نگاہیں ایک لمحے کے لئے محجوب انداز میں اشوک کمار کو دیکھتی ہیں اور پھر شرم کے بوجھ سے اس کی غلافی پلکیں جھک جاتی ہیں۔ یہ پلکیں پھر ہمیشہ کے لئے جھک

جاتی ہیں یعنی محبت شروع ہو جاتی ہے اور تھرڈ کلاس سے پبلک شور مچاتی ہے ۔۔۔ پبلک کا فیشن ہے کہ ہائے ہائے ۔۔۔!

اور لیلا چٹنس فوراً سنبھل کر اشوک کمار سے کہتی ہے۔

"نوجوان ۔۔۔ چونکہ تم نے میری جان بچائی ہے۔ اس لئے تم میرے گھر چل کر بسکٹ کھاؤ اور چائے پیو۔"

اشوک کمار کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ وہ دراصل ایک بیروزگار گریجویٹ ہے نوکری ڈھونڈنے شہر آیا تھا۔ لیکن نوکری نہ ملی لیلا چٹنس مل گئی۔

زرق برق کپڑوں والی لیلا چٹنس۔ اسی لئے اشوک کمار کچھ ہچکچاتا ہے۔ لیکن لیلا چٹنس کچھ ایسی مدھ بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتی ہے کہ اشوک کمار بھول جاتا ہے۔ کہ وہ پھٹے حال، خستہ حال اور تباہ حال ہے۔ بھوکا تو تھا ہی۔ بسکٹ اور چائے کی دعوت اُس کی آنکھوں میں گدگدی پیدا کر دیتی ہے۔ اور وہ لیلا چٹنس کے عالیشان گھر جاتا ہے۔ لیلا چٹنس اُسے ایک نرم صوفے پر بٹھا کر اندر چلی جاتی ہے۔ اشوک کمار پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس عالیشان گھر کی ہر عالیشان چیز کو دیکھتا ہے۔ اسی اثنا میں لیلا چٹنس اپنے عالیشان موٹے باپ کو بھی بلا لاتی ہے۔ اپنے اصلی باپ کو نہیں۔ اگر اصلی باپ ہو تو اشوک کمار کا سر سلامت نہ رہے اور نہ اس دیدہ دلیری سے لیلا چٹنس ایک آوارہ نوجوان کو اپنے گھر لا سکے۔ چونکہ وہ لیلا چٹنس کا فلمی باپ ہے۔ اس لئے لیلا چٹنس بھی اُس سے وہی برتاؤ کرتی ہے جو ایک فلمی سعادت مند بیٹی کر سکتی ہے (یہاں ایک بات میں آپ کو

بتا ہی دوں، سارے فلمی باپ عموماً بہت موٹے ہوتے ہیں ــــ ان کا ایک پیر سوجا ہوا ہوتا ہے۔ پردۂ سیمیں پر وُہ ہمیشہ دو عدد بغلی لکڑیوں کی مدد سے ادھر اُدھر پھدکتے نظر آتے ہیں۔ یہ بڑے زن مرید ہوتے ہیں۔ یہ اپنی فلمی بیٹی سے اُتنی ہی محبت کرتے ہیں۔ جتنی کہ اس فلمی بیٹی کی ماں یعنی موصوف کی فلمی بیوی اپنی فلمی بیٹی سے ناراض رہتی ہے کیونکہ فلمی بیٹی اس کے سوجے ہوئے پاؤں کی ہمیشہ مرہم پٹی کرتی ہے اور ماں کے زخموں پر نمک چھڑکتی ہے۔ فلمی ماں کو اپنی فلمی بیٹی کی آزاد خیالی اور آزادروی کبھی پسند نہیں ہوتی۔ مگر فلمی باپ ہمیشہ اپنی فلمی بیٹی کی آزادی کی سائیڈ لیتا ہے۔ یعنی طرفداری کرتا ہے اور فلم چلتی رہتی ہے)

ہاں تو لیلا چٹنس اپنے باپ سے شام یعنی اشوک کمار کا تعارف کراتی ہے پھر تینوں مل کر بسکٹ کھاتے ہیں اور چائے پیتے ہیں۔ چائے پی کر فلمی باپ معنی خیز انداز میں کھانستا کھنکارتا مسکراتا اپنی فلمی بیٹی اور اشوک کمار کے لئے میدانِ عشق ہموار کرتا ہے اور اشوک کمار صاحب کو اپنے فلمی کارخانے کی منیجری عطا کرتا ہے۔ اب کیا ہے۔ وہی اشوک کمار صاحب جو پھٹے پرانے کپڑوں سمیت نوکری ڈھونڈنے شہر تشریف لائے تھے۔ وُہ لیلا چٹنس کو بغل میں لیے ایک شاندار بالکون میں کھڑے ہو کر گا نا گاتے ہیں۔

آج موسم سلونا ــــ سلونا رے

ہاں سلونا رے

ہاں ہاں بیروزگاری کے بعد ایک کارخانے کی منیجری مل جائے تو موسم سخت

گرمی یا بھیانک خزاں کا ہو۔ ایک دم سونا ہو جاتا ہے۔

(۳)

شہری زندگی کی رومانٹک فلموں کی دوسری ابتدا۔ یہ کچھ ایسا ہوتا ہے۔ وہی بہت بڑے شہر کی بہت بڑی شاہراہ اور اس پر ایک بہت بڑی دوکان جس کے ایک کونٹر پر ایک طرف مس خورشید کھڑی ہیں تو دوسری طرف ماسٹر موتی لال۔ دونوں ایک دوسرے سے ناواقف شاپنگ کر رہے ہیں۔ دوکاندار دونوں کے ہاتھ میں وہ پیکیٹ دے دیتا ہے اور وہ دونوں اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہی دوسرے منظر میں اور آپ سب دیکھتے ہیں۔ دیکھتے ہیں اور بے تحاشا قہقہے لگاتے ہیں کہ ایک طرف موتی لال پتلون پر بلاؤز پہنے کھڑا ہے اور دوسری طرف مس خورشید ہاتھ میں شیونگ اسٹک لئے اس کا مصرف سوچ رہی ہیں۔

تیسرے منظر میں وہ دونوں ایک دوسرے کا پیکیٹ واپس کرنے ایک دوسرے کے گھر جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور پھر کہیں سے کیوپڈ آتا ہے اور دو عدد محبّت کے تیر دونوں کے دلوں میں چبھوتا ہے ہیرو کی اس چبھن سے بلبلا کر وہ گانے لگتے ہیں۔

موتی لال صاحب فرماتے ہیں :۔

..... محبت ہو گئی

خورشید جواب دیتی ہے :۔

ہاں کہانی بن گئی

(۴)

رومانٹک فلموں کی تیسری ابتدا یوں ہوتی ہے ۔ وہی بہت بڑے شہر کی بہت بڑی شاہراہ ۔۔ ایک طرف سے مس رمولا سائیکل پہ چلی آ رہی ہیں ۔ دوسری طرف مسٹر نارنگ بھی تیز سائیکل پہ اڑتے چلے آ رہے ہیں ۔ ایک موڑ پر اچانک دونوں کی سائیکلیں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتی ہیں ۔ مس رمولا چونکہ بہت خوبصورت ہے ، اس لئے انہیں بہت غصہ آتا ہے اور وہ ماسٹر نارنگ کے موٹے گال پر ایک زوردار طمانچہ لگا دیتی ہے ۔۔ ہال میں پبلک ہنستی ہے اور پردۂ سیمیں پر مس رمولا دوبارہ سائیکل پر سوار بڑے ہیجسٹک انداز میں پیڈلنگ کرتی اپنا گلابی دوپٹہ فضا میں اڑاتی چلی جاتی ہیں مگر ماسٹر نارنگ اس طرح افسوسناک حالت میں پڑے گال سہلاتے ہوئے بھگوان صاحب مطلع کرتے ہیں ۔

"ہے بھگوان ۔۔ یہ میٹھا میٹھا طمانچہ تو عشق بن کر دل میں بیٹھ گیا ہے"۔

اس کے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ۔ اگلا پہیہ اپنی دونوں ٹانگوں میں پھنسا کر مڑا ہوا ہینڈل سیدھا کرتے ہیں اور اداس ، ملول ، محزون و مغموم سائیکل پر سوار ہو جاتے ہیں ۔ تھوڑی ہی دور جانے نہ پائے کہ سڑک پر ایک بگھی لڑھکتی ہے اور اس میں سے بہت موٹا تیس آدمی سڑک پر گر پڑا ہے ۔ مسٹر نارنگ دوڑ کر اسے سنبھالتے ہیں ۔ اور موٹر ٹیکسی کے ذریعے اس کو اس کے گھر پہنچا دیتے ہیں ۔ گھر پہنچ کر موٹا تیس اس

اُس سے کہتا ہے :-

" نوجوان چونکہ تم نے میری جان بچائی ہے۔ اس لئے فلمی دستور کے مطابق تم بسکٹ کھاؤ اور چائے پیو"۔

مسٹر نارنگ صرف مسکرا کر اظہارِ رضامندی فرماتے ہیں اور مسٹر نارنگ ڈرائینگ روم میں لگی ہوئی فلمی تصویروں کو دیکھنے لگتے ہیں۔ اسی اثنا میں مس رمولا باہر سے آتی ہیں اور ڈرائینگ روم میں نارنگ کو دیکھ کر ٹھٹھک جاتی ہیں اور بڑے غصہ سے استفسار فرماتی ہیں۔

" کیوں جی! کیا تم وہی غنڈے ہو جس نے آج میری سائیکل کو ٹکر دی تھی"۔

نارنگ انتہائی ہیروانہ انداز میں جواب دیتا ہے :-

" جی ہاں محترمہ" ــــ یہ سعادت سوائے ہیرو کے کسی اور ایکٹر کو تھوڑے ہی حاصل ہے۔

رمولا فیصلہ کن لہجے میں کہتی ہے۔

" یہ بات ہے تو پھر تم بدمعاش ہو ــــ پھر میرے گھر کیوں آئے"؟

اب نارنگ صاحب ٹائی کی گرہ ٹھیک کر کے بڑے اکڑ کے جواب دیتے ہیں

" کیونکہ میں اس گھر کا مالک ہوں"۔

رمولا کا غصہ قابلِ دید ہے اور اُس کا سوال قابلِ شنید۔

" تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے"؟

نارنگ اُردو شاعری سے ایک مصرعہ اُٹھالیتا ہے

"آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا"

رمولا غصہ سے بے قابو ہو کر چیختی ہے۔

"نکل جاؤ یہاں سے غنڈے، بدمعاش، لوفر"

نارنگ اُس وقت بڑے صبر و تحمل، بڑی ضبط و احتیاط اور بڑے رومانی انداز میں مسکرا کر اُردو شاعری سے ایک پورا شعر اُٹھالیتا ہے۔

اُن کو آتا ہے پیار پر غصہ

ہم کو غصہ پہ پیار آتا ہے

رمولا پیر پٹکتی ہے اور اندر جاتی ہے تاکہ نوکروں کو بلا لائے۔ دو سیکنڈ کے بعد اسی ڈرائینگ روم میں ایک دروازہ سے مس رمولا کا باپ معہ ایک نوکر اور چیلے کی کشتی کے داخل ہوتا ہے اور دوسرے دروازے سے مس رمولا اور ایک درجن نوکروں کی بٹالین مارچ پاسٹ کرتی داخل ہوتی ہے۔ رمولا کا فلمی باپ رمولا کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہتا ہے:۔

"اوہ بیٹی! تم آگئیں ــــ اچھا کیا ــ چلو ان سے ملو۔ یہ آج نہ ہوتے تو تم یتیم ہوگئی ہوتیں بیٹی ــ"

(یہاں ایک بات قابلِ غور ہے اور وہ قابلِ غور بات یہ ہے۔ ہندوستانی فلمی ہیرو ہمیشہ سے ہیروئن کے باپ کی جان بچاتے رہے ہیں۔ ایسی کبھی کوئی فلم نہیں بنائی

گئی۔ جس میں ہیرو نے ہیروئن کے دادا یا پردادا۔ نانا یا پرنانا کی جان بچائی ہو خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اس جملہ معترضہ کے بعد رمولا کی پلکیں جھک جاتی ہیں۔ یہاں میں آپ لوگوں سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ عورت کی پلکیں کب اور کیوں جھکتی ہیں؟

اس کے بعد دونوں چائے پیتے ہیں۔ چائے پیتے پیتے ماسٹر نارنگ سیب کے ایک آدھ ٹکڑے میں چھری چبھو دیتا ہے۔ یعنی دل میں عشق کی چھری چبھو دیتا ہے۔ ایک نارنگ پر ہی پر کیا موقوف ——— ہمارے سبھی ہندوستانی ہیرو سیب کے آدھے ٹکڑے میں چھریاں چبھونے میں بہت زیادہ مشاق ہیں۔

ادھر سیب کے آدھے ٹکڑے میں چھری چبھی اور ادھر پس منظر میں طربیہ موسیقی کے سُر بلند ہوئے اور دوگانا شروع ہو گیا۔

مس رمولا۔ ساون کے نظارے ہیں

ماسٹر نارنگ۔ آہا آہا

مس رمولا۔ کلیوں کی آنکھوں میں

ماسٹر نارنگ۔ مستانہ اشارے ہیں

مس رمولا۔ آہا آہا

(۵)

ادھر پانچ چھ برسوں میں بعض فلم اسٹوری رائٹرز نے آغازِ محبت کے ان طریقوں سے بیزار ہو کر ایک جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے یعنی یہ کہ فلمی ہیرو جو بالعموم غریب آدمی ہوتا ہے

اور فلمی ہیروئن جو بالعموم مالدار عورت ہوتی ہے۔ ان دونوں میں محبت کسی حادثہ کی وجہ سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ ہیرو غریب آدمیوں کا لیڈر ہوتا ہے۔ غریب آدمیوں کے دکھوں، غموں اور بیچارگیوں کی اصالتاً یا وکالتاً نمائندگی کرتا ہے۔ ہیروئن کی ہیرو سے ٹکر نہیں ہوتی بلکہ ہیروئن ہیرو پر ترس کھاتی ہے اور یہ ترس کیا ہے؟ — کیا ہے یہ ترس؟ — یہ ترس محبت ہے — ہاں صاحب یہ ترس محبت ہے اور محبت بس ایسے ہی چپ چاپ شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے ساون کی جھڑی —— (یہاں یہ تشبیہ کچھ موزوں نہیں ہے مگر چونکہ غیر موزونیت بھی بعض اوقات جدت کا ثبوت ہے۔ اس لیے ساون کے نظارے ہیں۔ آہا آہا۔

(۶)

رومانوی فلموں کا ماحول اگر شہر کی بجائے دیہات ہو تو محبت کا آغاز یوں ہوتا ہے ہیرو شہر سے خوب پڑھ لکھ کر یا بعض اوقات انگلستان کی تعلیم حاصل کر کے اپنے چھوٹے سے گاؤں میں آتا ہے۔ گاؤں ابھی دو تین کھیت دور ہے کہ ایک شریر چنچل لڑکی ہیرو کے تانگے یا بیل گاڑی میں سے چپکے سے ہیرو کے میوے کی ٹوکری چرا لیتی ہے۔ ہیرو اس وقت گانے یا اونگھنے میں اتنا محو ہوتا ہے کہ اسے خبر ہی نہیں ہوتی۔ شریر لڑکی سارے میوے خود کھاتی ہے اور اوروں کو کھلاتی ہے اور چھلکے پھر سے ٹوکری میں بھر کر ٹوکری تانگے یا بیل گاڑی میں رکھنے جاتی ہے تو ہیرو اس کو پکڑ لیتا ہے۔ شریر لڑکی اس کا منہ چڑاتی ہے، چہلیں کرتی ہے۔ ہیرو اس وقت غصہ میں آ جاتا ہے۔ مگر بوڑھا تانگے والا

یا گاڑی بان ہنستے ہنستے کہتا ہے۔

"رمیش بابو —— یہ تو اپنی موسی شانتا بائی کی لڑکی رادھا ہے۔ ہی ہی ہی۔"

"رادھا ! —— اوہ رادھا اتنی بڑی ہو گئی !"

ہیرو کا یہ جملہ استعجابیہ دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ اوہ رادھا اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ میں اُس سے بآسانی عشق کر سکتا ہوں۔ چنانچہ گھر پہنچ کر وہ اُس سے ایک دم عشق کرنے لگتا ہے۔

فلم ڈائرکٹر

نظیر اکبر آبادی کے رنگ میں میرا ایک غیر موزوں شعر ہے۔

جو فلم دیکھتا ہے سو ہے وُہ بھی آدمی
اور جو فلم بناتا ہے سو ہے وُہ بھی آدمی

یہ شعر کہنے کی خاص طور پر مجھے اس لئے ضرورت پیش آئی کہ بعض نازک مزاج نشستہ مذاق فلم بین خواتین و حضرات فلم ڈائرکٹروں کو بالعموم آدمی سے بھی کمتر ہستی تصور کرتے ہیں۔ مثلاً اپنی زندگی کے کسی نہ کسی لمحہ کسی نہ کسی فلم کے بارے میں کسی نہ کسی شخص کی زبان سے آپ نے یہ جملہ ضرور سنا ہوگا — کہ اوہ — وُہ فلم — اس کا ڈائرکٹر تو بس .... معلوم ہوتا ہے۔

چونکہ یہ ریمارک صریح غلط ہے اور مشہور فلم ڈائرکٹر مسٹر دلیپ چندر گپتا (یہ نام ظاہر بات ہے کہ بالکل فرضی ہے) میرے جگری دوست ہیں اور آدمی ہیں۔ صدفی صد آدمی ہیں۔ سو بہ سو آدمی ہیں۔ اسی لئے مجھے نظیر اکبرآبادی کے رنگ میں ایک شعر ناموزوں کرنے اور یہ تردیدی مضمون لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ تاکہ سند رہے اور عند الضرورت کام آئے۔

اب بعد سلام و تسلیمات واضح ہو کہ مسٹر دلیپ چندر گپتا نہ صرف آدمی ہیں بلکہ قابل ترین ڈائرکٹر ہیں جس کے لئے بقول شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال۔ نرگس ہزاروں سال تک چمن میں روتی رہی۔ تب کہیں مسٹر دلیپ چندر گپتا ماسٹر وٹھل کے عشق میں پڑھنا لکھنا چھوڑ والدین کو داغِ فراری دے بہت نوعمری کے عالم میں کاٹھیاواڑ سے بمبئی تشریف لائے۔ جس وقت وہ بمبئی تشریف لائے۔ اس وقت ان کا حلیہ کیسا تھا۔ ماسوائے ماسٹر وٹھل کے کوئی نہیں بتا سکتا۔

البتہ ان کا حالیہ حلیہ یہ ہے۔ درمیانہ قد ½5 × ۳۳، رنگ براؤن، دبلا ڈیل متناسب ڈول ہنس مکھ، چیچک رو، ہونٹ میری طرح موٹے آنکھیں میری طرح کرنجی۔ گال بھرے بھرے، نظر دلاری۔ ادا ہنسنے کی پیاری سی —— جب تک فلم ڈائرکٹر نہ بنے تھے۔ اس وقت تک دھاری دار لمبا کرتہ۔ دھوتی، سیاہ رنگ کی کجی ٹوپی۔ لیکن جب سے ڈائرکٹر بنے ہیں۔ اس وقت سے سفید پتلون اور کالا ماروا ڑی ڈیزائن کا کوٹ پہنتے ہیں۔ البتہ اب ٹوپی اوڑھنا انہوں نے ترک کر دیا ہے۔ تہوار یا شوٹنگ کے وقت

ایک سبز رنگ کا بوشرٹ بھی پہنتے ہیں۔ مگر بقول نور محمد صاحب چار کی۔ ہمیشہ نہیں کبھو کبھو۔

مسٹر گپتا کی علمی قابلیت اور فنی استعداد کے بارے میں اکثر لوگوں نے مجھ سے استفسارات کئے۔ حتیٰ کہ ایک دن خود میں نے گپتا سے پوچھا۔ تو انہوں نے بڑے ٹھنڈے سے لہجے میں فرمایا:۔

"ابھی ادھر ہم کو علم کی کیا جرورت ہے۔ بھگوان نے ادھر ہم کو مگز دیا ہے۔ اس کی کرپا سے سالا ہم نے بیس پر چار فلم ڈائرکٹ کیا اور سالا سب کا سب ہٹ (Hit) ہو گیا۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ بھگوان نے مسٹر گپتا کو مغز دیا ہے اور اس کی کرپا ان کی جو بیس کی چوبیس فلمیں جس جس سینما میں گئیں۔ کئی کئی ہفتے بہار ہفتے گزار کر آئی ہیں اور اکثر شہروں میں تو ان کی بعض فلموں کی سلور جوبلیاں بھی منائی گئیں۔

اب آپ ہی فرمایئے۔ فلم ڈائرکٹر کے لئے تعلیم و تربیت کی کیا ضرورت ہے۔ بھگوان نے جو مغز دیا ہے۔ وہ میں سمجھتا ہوں بہت کافی ہے۔ ویسے آج کل فلم انڈسٹری میں اچھے اچھے بی اے، ایم اے پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن جو بات مسٹر گپتا میں ہے وہ ان ڈگری ہولڈروں میں کہاں۔ مسٹر گپتا کو فلم انڈسٹری کا کوئی بیس سالہ تجربہ ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے عرض کیا ہے کہ مسٹر گپتا نے انتہائی نوعمری کے عالم میں فلم لائن جوائن کی تھی۔ تاریخ اور سن تو سوائے ماسٹر وٹھل کے کسی کو یاد نہیں۔ البتہ اتنا یاد ہے

کہ مسٹر گپتا چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔ سینما کے بہت شوقین تھے۔ بالخصوص جب مسٹر وٹھل کی کوئی فلم آجاتی تو مسٹر گپتا تین تین چار چار بار اس فلم کو دیکھتے۔ ماسٹر وٹھل سے انہیں افلاطونی قسم کا عشق ہو گیا تھا۔ خدا بخش مولا بخش سینما فوٹو اینڈ بک سیلرز کے پاس سے انہوں نے ماسٹر وٹھل کی ایک درجن تصویریں خریدی تھیں۔ ان کی جیب اکثر مُبزر رکھتے۔ البم کی آدھی رات کو تلاشی لیجئے اور آدھی رات کو ماسٹر وٹھل سے بھی مل لیجئے۔

بہرحال ماسٹر وٹھل کے عشق نے مسٹر گپتا کو کچھ ایسا وارفتہ کر دیا کہ مسٹر گپتا نے لکھنا پڑھنا چھوڑ ماں باپ کے ہاتھوں پر کلنک کے ٹیکے لگائے۔ تجوری میں سے روپے چرائے۔ کھانا لڈو کھائے۔ بستر باندھ ریل گاڑی پر سوار ہوئے۔ بمبئی پہنچے اور ماسٹر وٹھل کے درشن کئے۔ ماسٹر وٹھل اپنے اس نوعمر پجاری کو دیکھ کر قہقہے لگاتا رہا جب قہقہے ختم ہو گئے تو انہیں نظر ترحم سے دیکھا۔ جب نظر ترحم تھک گئی تو انہیں اپنے گھر نوکر رکھ لیا۔

جس طرح گھر کا بھیدی لنکا ڈھا دیتا ہے۔ اسی طرح ہیرو کے گھر کا نوکر بھی فلم انڈسٹری ڈھا دیتا ہے۔ چنانچہ مسٹر گپتا نے بھی ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کئے۔ اس پکچر میں نوکر کا پارٹ کیا تو اس پکچر میں مسخرے کا رول سرانجام دیا۔ فلم "باون کچھو" میں ڈاکٹر بن کر ہیروئن کے پرداداکی نبض دیکھی تو فلم "بلدے کا پھول" میں پولیس انسپکٹر بن کر رقیب کو گرفتار کیا۔

فلم دلارا ڈاکو میں قوالی کی ایک محفل میں تالیاں بجا رہے تھے تو فلم "توپ کا گولہ"

ہیں دھوبیوں کے ساتھ ایک گھاٹ پر کپڑے دھوتے نظر آئے تھے۔
اسی طرح ان چھوٹے بڑے کاموں کے مسلسل بیس سالہ سنگین تجربات نے اُنہیں ایک دن فلم ڈائرکٹر بنا دیا۔ اس بیس سالہ ریاضت کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ان کی ڈائرکٹ کی ہوئی فلمیں جب کسی شہر میں دکھائی جائیں تو لوگ فلم کے نام اور فلم کی کاسٹ کو اتنی اہمیت نہیں دیتے جتنا کہ مسٹر گپتا کے نام کو اہم سمجھتے ہیں۔ چاہے فلم کا نام توپ کا گولہ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر اسے مسٹر گپتا نے ڈائرکٹ کیا ہو تو پھر کچھ نہ پوچھئے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں کوئی توپ کا گولہ آگرا ہے اور لوگ پناہ لینے کے لئے سینما ہال کی طرف دوڑ رہے ہیں۔
اب میری یہ انتہائی خوش قسمتی ہے کہ آج کل مسٹر گپتا سے میرا دن رات کا واسطہ ہے۔ ہم دونوں چوبیس گھنٹوں میں روزانہ سات آٹھ گھنٹوں کے ساتھی اور رفیق ہیں یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ مسٹر گپتا سے ملنے کے لئے لوگ ترس ترس جاتے ہیں۔ ہر روز صبح اسٹوڈیو کے پھاٹک پر فلم کے شوقین۔ نوجوان اور خوبصورت لڑکیاں اور لڑکے دربان کی خوشامد کرتے ہیں۔ کہ بس ایک بار ڈائرکٹر صاحب سے ملا دو۔ مگر جس کی قسمت میں ان سے ملاقات کا شرف لکھا ہے۔ وہی ان سے مل سکتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک لعبتِ پنجاب، چندے آفتاب چندے ماہتاب، حسینانِ جہاں سے ایک انتخاب لاجواب تین روز تک مسٹر گپتا کے درشن کو ترستی رہی مگر مسٹر گپتا کو فرصت ہی نہ ملی۔ اس کے بعد

وہ لڑکی کہاں چلی گئی۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ پتہ چلا تو صرف یہ کہ فلم ڈائرکٹر وہ ہستی ہے۔ جس کی جانب حسن خود کشاں کشاں چلا آتا ہے۔ پنجاب کا جسم۔ بنگال کی زلفیں۔ لکھنؤ کا دہن گجرات کی کمر۔ حیدرآباد کی آنکھیں۔ یہ سب مسٹر دلیپ چندر گپتا کی ایک نگاہِ غلط انداز کے لئے ترستی رہتی ہیں مگر مسٹر گپتا ہیں کہ ان کی طرف کنکھیوں سے بھی نہیں دیکھتے اور ایک میں ہوں کہ سدا خونِ جگر میں نے پیا ہے۔

مسٹر گپتا کہتے ہیں کہ بھگوان نے اُنہیں جو مغز دیا ہے۔ وہ مغز مجھے نہیں دیا یہی وجہ ہے کہ کمپنی کے سیٹھ صاحب مجھ سے اتنے مرعوب نہیں جتنے مسٹر گپتا سے مرعوب ہیں سیٹھ صاحب کی نظروں میں میں نے ہمیشہ مسٹر گپتا کو گرانے کی کوشش کی ہے۔ مگر بھگوان کی کرپا سے میں مسٹر گپتا کا بال نہ بیکا کر سکا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ہماری نئی فلم کے شوٹنگ کے سلسلہ میں یہ سوچا جا رہا تھا کہ فلم شروع کس طرح ہو جب ہر شخص نے اپنے اپنے مغز کے مطابق رائے دی تو آخر مسٹر گپتا کھڑے ہو گئے اور اُنہوں نے سیٹھ صاحب سے فرمایا:۔

"رائے صاحب! ابھی ادھر میرے مگز میں ایک بات آئی ہے۔ جب اسکرین پر شروع میں لائٹ پڑے تو اُس میں سے ایک کتاب گرے جس پر لکھا ہو — "اُجالا مندر کی پیشکش —— جوانی اور بڑھاپا"۔

سبھوں نے اس عجیب و غریب آغاز کی بڑھ بڑھ کر داد دی اور میں حیران و پریشان مسٹر گپتا اور رائے صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ رائے صاحب نے مجھے خاموش

دیکھ کر پوچھا "آپ کیوں سائلنٹ ہیں ابرام بھائی"۔

میں نے کہا "مظہر العجائب رائے صاحب! آپ پوچھ رہے ہیں کہ میں کیوں سائلنٹ ہوں۔ اب آپ ہی فرمایئے کہ میں سائلنٹ کیسے نہ ہو جاتا۔ مسٹر گپتا اور رائے صاحب اور دیگر لیڈیز اینڈ جنٹلمین! میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ لوگ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ جب سے دنیا قائم ہوئی ہے۔ اس وقت سے آج تک کسی توپ سے گولے کی بجائے کوئی کتاب گری ہے؟ محفل پر ایک منٹ کے لئے سنّاٹا طاری ہو گیا۔ میرا اعتراض معقول تھا مگر صاحب — بھگوان نے مسٹر گپتا کو مگز دیا ہے انہوں نے سنبھل کر مجھ پر وار کیا۔" ابرام بھائی! ابھی سالا آپ کو ادھر فلم کا ٹیکنیکل بیوٹی معلوم نہیں۔ یہ تو ناولٹی ہے۔ آپ اس کو چھوڑو ادھر۔ ادھر لٹریری سائڈ سنبھالو ہم ادھر ٹیکنیکل سائڈ دیکھ لیں گا"۔

یہ کہنا تھا کہ سب کے سب حتیٰ کہ رائے صاحب اور ساحر لدھیانوی تک فرمانے لگے "ہاں ہاں۔ بالکل ناولٹی ہے ٹیکنیکل بیوٹی ہے۔ ابرام بھائی۔ ابھی تم ادھر اپنا لٹریری سائڈ سنبھالو"۔

چنانچہ میں نے لٹریری سائڈ سنبھال لی اور آج تک سنبھالے ہوئے ہوں اور خدا سے دست بدعا ہوں کہ مجھے اتنی طاقت عطا کرے کہ زندگی کے آخری سانس تک صرف لٹریری سائڈ سنبھالے رہوں اور ادھر مسٹر گپتا توپ سے گولے کی بجائے کتاب۔ ٹوپی۔ جوتے۔ خربوزے۔ صابن۔ پوڈر کے ڈبّے، الا بلا وغیرہ وغیرہ گرایا کریں اور ناولٹیز

کی فہرست میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے۔

مقام شکر ہے کہ مسٹر گپتا نے آج تک لٹریری سائڈ کی طرف توجہ نہیں کی۔ ورنہ شاید مجھے دوسرے ہی دن فلم انڈسٹری سے باہر نکال دیا جاتا۔

جب میں مسٹر گپتا کو اپنے لکھے ہوئے مکالمے سناتا ہوں تو مکالمے کے حسن و قبح کی طرف توجہ دینے کے بجائے اپنی ٹیکنیکل سائڈ ہی میں غرق رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک مکالمہ سناتا ہوں:۔

سریش نے شیلا سے کہا "پیاری شیلا! ادھر آؤ"

تو مسٹر گپتا فرماتے ہیں۔ "ٹرالی کمز فارورڈ" اگلے فقرے پر مسٹر گپتا فرماتے ہیں کیمرہ چینجز اینگل۔ کٹ اِن۔ کٹ آوٹ"۔ وغیرہ۔

اب میرا جی چاہتا ہے کہ سر کے بال نوچ لوں۔

اگر ساحر لدھیانوی اور حمید اختر وقتاً فوقتاً میری دلجوئی نہ کرتے ہوتے تو شاید فلم لائن چھوڑ کر میں اس ادبی مذاق رکھنے والے ایکٹرس کی پرائیویٹ سکرٹری شپ قبول کر لیتا جس نے مجھ سے اچھی تنخواہ۔ اچھا مکان۔ اچھا لباس اور جلد ترقی کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن چونکہ اکثر لوگوں نے کہا کہ ایک ایکٹرس کی پرائیویٹ سیکرٹری شپ میں عزت نہیں ہوتی۔ اسی لئے میں آج تک مسٹر گپتا کی رفاقت میں تنخواہ، کوفت اور عزت حاصل کر رہا ہوں

مسٹر گپتا کو بھی عزت کا بڑا خیال ہے۔ چنانچہ وُہ مجھے اکثر نصیحت فرماتے ہیں "اپنا ادھر کیا ہے سالا ابرام بھائی ـــ عجت۔ نکت عجت۔ ابھی ادھر عجت

نہیں ہے تو سالا پائیزن کھانے کا ٹائم آجائے گا۔ یہ روپیہ پیسہ تو سالا ہاتھ کا میل ہے"

یہ بالکل صحیح ہے کہ مسٹر گپتا کو عزت کا بڑا خیال رہتا ہے اور روپے پیسے کو وہ ہاتھ کا میل تصور کرتا ہے۔ مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ مسٹر گپتا کے ہاتھ ہمیشہ میلے کیوں رہتے ہیں؟

بہت ممکن ہے کہ ان ساری باتوں کو سننے کے بعد آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ میں حد درجہ مبالغے سے کام لے رہا ہوں اور اکثر جگہ آپ کو سچائی پر جھوٹ کا گمان ہو تو یہ بدگمانی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اگر بالفرض اس مضمون میں کہیں کوئی واقعہ آپ کو واقعی جھوٹا معلوم ہو تو آپ یقین رکھئے کہ یہ واقعہ مستقبل قریب میں سچ میں تبدیل ہو جائے گا۔ کیونکہ ہم لوگوں کو مسٹر گپتا کی ذات سے چند خاص امیدیں وابستہ ہیں اور مسٹر گپتا ان لوگوں میں سے ہیں جو ملک و قوم کے نیک توقعات بکمال مستعدی پوری کرتے ہیں۔ مثلاً پچھلے دنوں مسٹر گپتا کے متعلق ساری فلم انڈسٹری میں ایک واقعہ مشہور ہو گیا۔ کہ کچھ لوگ مسٹر گپتا سے ملنے گئے۔ باتیں کرتے کرتے ایک ملاقاتی کو کہیں ٹیلیفون کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ چونکہ ٹیلیفون نمبر یاد نہیں تھا۔ اس لئے ملاقاتی نے مسٹر گپتا سے پوچھا:۔

"ڈائرکٹر صاحب۔ ڈائرکٹری کہاں ہے؟"

ڈائرکٹر صاحب نے شرما کر جواب دیا "جی۔ وہ تو پانی نہانے گئی ہوئی ہے۔"

ہم لوگوں نے جب یہ واقعہ سنا تو آپ کی طرح ہم نے بھی اسے سفید جھوٹ ہی سمجھا اور امتحاناً ہم نے ایک دوسرے موقع پر مسٹر گپتا کی موجودگی میں کہیں ٹیلیفون کرنا چاہا

اور ڈائرکٹری کے بارے میں پوچھا تو اُنھوں نے بہ کمال سادہ لوحی جواب دیا۔

"بھئی وُہ تو آج کل بیمار ہے۔"

اب آپ ہی فرمایئے کہ اس واقعہ سے بھی آپ کو میری نسبت سخن سازی کا کوئی احتمال ہے؟ —— اگر نہیں ہے تو آیئے پھر ہم سب مل کر دعا کریں۔ کہ اے باری تعالیٰ . . . . . آمین۔ ثم آمین۔

پبلک سیفٹی ریزر

(حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم کے ایک شعری دوست شیخ جی کے دو باہنر لڑکے پیدا ہوئے تھے۔ ایک لڑکا بیچارا پھانسی پا گیا۔ دوسرا خفیہ پولیس میں بھرتی ہو گیا ہے۔ میں اس مضمون کو شیخ جی کے اسی زندہ اور موخر الذکر لڑکے کے نام معنون کرتا ہوں)

فطرت کا ایک اہم ترین قانون یہ ہے کہ جب مرد جوان ہوتا ہے تو اس کے ڈاڑھی مونچھ نکل آتی ہے یا اس کے داڑھی مونچھ نکل آئے تو اس کو مرد سمجھا جاتے۔ بہر حال داڑھی اور مونچھ دونوں کا مرد کے چہرے سے لازم تعلق ہوتا ہے۔ چاہے کوئی اسے صفاچٹ کر دے اور چاہے کوئی نہ کرے۔ ویسے بغیر بریکیٹ کے میں یہ عرض کروں گا کہ پیدائشی فارغ البال لوگ فطرت کے اس کلیہ سے اس لئے مستثنیٰ ہیں کہ مستثنیٰ ہونا ان کا پیدائشی حق ہے۔

اسی ضمن میں یہاں ایک اور سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ عورتیں جن کے ذرا ذرا سی مونچھیں نکل آتی ہیں تو کیا وہ بھی مرد ہیں؟ —— یہ سوال چونکہ بہت نازک ہے اور یہ

سوال صنفِ نازک سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا جواب میں نہیں دوں گا۔ بلکہ میرے بچپن کی استانی مادام میبل ولسن دیں گی۔ جن کے بھی ذرا ذرا سی مونچھیں تھیں۔

میری اُستانی مادام میبل ولسن بڑی قابلِ تعارف ہستی ہیں اور پبلک سیفٹی ریزر کے ضمن میں ان کا ذکر نہایت ضروری ہے۔ اس لئے میرا تعارف کرانا اور اُن کا متعارف ہونا اخلاقی فرائض میں داخل ہے۔ یہ محترمہ لارڈ کلائیو کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں ان کے جد کے جدامجد اور جدامجد کے جداعلیٰ کے جدِ اعلیٰ وارفع لارڈ کلائیو تھے۔ اسی لئے لندن شہر کے علاوہ تاریخ انگلستان اور بکنگھم پیلیس میں ان کے خاندان کو بڑی شہرت بڑی بدنامی اور بڑی نیک نامی حاصل ہے۔ ہندوستان کی انقلابی تحریک میں کام کرنے والے مادام میبل کو برطانوی سامراج کا سمبل بھی قرار دیتے ہیں۔ مادام میبل نہ صرف سیاست میں ایک اہم ہستی ہیں بلکہ میری اپنی زندگی میں بھی ان کو تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ اب سے بیس سال پہلے چیپل روڈ سکندرآباد پر سینٹ پال کیتھڈرل کی دی موسٹ ہولی روزمیری کانونٹ سے ملحقہ مادام میبل ولسن کا ایک ہوسٹل تھا۔ جہاں انگریز لڑکوں اور لڑکیوں کے علاوہ دیسی بادشاہوں۔ راجواڑوں۔ جاگیرداروں اور نوابوں کے لڑکے بورڈ اور لاج کرتے تھے۔ جن میں سے میں بھی ایک تھا۔ میں خدانخواستہ ایک کروڑ بار۔ خدانخواستہ کسی دیسی بادشاہ جاگیردار یا نواب کا قرۃ العین نہیں تھا۔ بلکہ بات یہ ہوئی تھی کہ جب میں چھ سال کا تھا تو میری والدہ کا انتقال ہوگیا تھا اور والد صاحب نے اچھی تربیت کی خاطر مادام میبل ولسن کے ہوسٹل میں شریک کرا دیا تھا۔ جہاں میری اتنی اچھی تربیت ہوئی کہ:

Twinkle! Twinkle Little Stars
How wonder! What you are

باقی ہارٹ یاد کرنے کے علاوہ میں یسوع مسیح کی ایک ایک بھیڑ سے واقف ہوگیا تھا اسی لئے مادام میبل مجھے بہت چاہتی تھیں۔ اتنا چاہتی تھیں کہ جب وہ کورٹ شپ کے لئے لندن جانے لگیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئیں۔ لندن میں ان کے ہونے والے شوہر رابرٹ صاب کا ایک سیفٹی ریزر کا کارخانہ تھا جو آج تک

Link House, Nor Folk Mansions,
Mestine Lane, Old Bond Street
London W. C.

پر واقع ہے۔ چھ مہینے لندن میں کورٹ شپ کرنے کے بعد مادام میبل اور میں ہندوستان واپس آئے تو ان کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ دی موسٹ ہولی روزمیری کانونٹ کا وہ ہوسٹل بند کرکے اپنے ہونے والے شوہر رابرٹ صاب کی پیار آمیز ہدایات کے تحت ہوسٹل کو سیفٹی ریزر کی ہول سیل ایجنسی رکھنے والی فرم میں تبدیل کر دیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے قومی رہنماؤں نے ہندوستان اور پاکستان کو آزاد کرانے کے بعد دونوں ملکوں کو پبلک سیفٹی ریزر کی ہول ایجنسی رکھنے والی فرموں میں تبدیل کر دیا ہے۔ مادام میبل کی معرفت مجھے بچپن ہی سے سیفٹی ریزر اور اس کے کارخانے اور اس کی

صنعت سے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ اس لئے جب میں سکول سے نکل کر یونیورسٹی میں آیا اور انٹرمیجیٹ سے بی، اے تک معاشیات بطور آپشنل پڑھتا رہا تو مجھے خیال پیدا ہوا کہ اس صنعت کی معاشی تحقیق کی جانی چاہیئے۔ چنانچہ میں نے اس صنعت کے بارے میں بڑی شغف سے تحقیقی مواد تلاش و فراہم کرنا شروع کر دیا۔ میرے اور ساتھی جو بٹن فیکٹری، سیمنٹ فیکٹری، گن فیکٹری، سگریٹ فیکٹری اور آل سارٹس آف فیکٹریز پر تحقیقی مقالے تحریر کر رہے تھے۔ میں نے اُن کے آگے اپنا یہ ناقص خیال ظاہر کیا تو اُنھوں نے تبسّم کیا اور قہقہے بھی لگائے اور مجھے سوچنا پڑا کہ اس میں تبسّم کرنے اور قہقہے لگانے کا کیا محل اور موقع ہے؟

جب امریکہ ایٹم بم کی ایجاد پر اور انگلستان شہزادی الزبتھ کے پہلے بچے یعنی آنے والے بادشاہ کی پیدائش پر تقریریں، مقالے اور فلمیں تیار کر سکتا ہے تو اپنے ہم وطن کی اس مشہور و معروف صنعت کے بارے میں ایک آدھ مضمون لکھتے ہوئے کیوں شرمائیں بالخصوص جبکہ ایٹم بم جن مقاصد کے پیش نظر ایجاد کیا گیا اور شہزادی الزبتھ کا بچہ جن خوابوں کی تعبیر کے لئے پیدا کیا گیا۔ کم و بیش انہی خوابوں کی تعبیر اور انہی مقاصد کی تکمیل ہمارے ملک میں اپنی حیثیت کے مطابق پبلک سیفٹی ریزر بھی کر سکتا ہے۔ کرتا ہے اور کر رہا ہے

مگر استعجاب اور سخت استعجاب کا مقام ہے کہ اس حیرت انگیز صنعت کے بارے میں ہندوستان اور پاکستان کے سارے صنعتی ماہرین اور معاشی محققین مینو مسانی سے لے کر طفیل احمد خاں تک سب ایسے ہی خاموش ہیں جیسے گڑ کھانے والے گونگے

جہاں تک میری دیدہ ریزی۔ دماغ سوزی اور جگر کاوی سے پیدا شدہ تحقیقات کے نتائج کا تعلق ہے۔ پبلک سیفٹی ریزر سب سے پہلے فرعونِ مصر کے حکم سے ایجاد ہوا۔ لیکن عہدِ سیم و زریں فیوہرر اڈولف ہٹلر نے باضابطہ طور پر اس صنعت کو صنعت کی طرح مروّج کیا۔ اور ہر ہالونس۔ ہرفان بوگس۔ ڈاکٹر گوبلز کو اس صنعت کا سب سے بڑا ڈائرکٹر مقرر کیا۔ اس کا سب سے بڑا کارخانہ دریائے رائین کے کنارے جرمن ایشتاغ میں قائم کیا گیا تھا۔ پہلے پہل تو یہ کارخانہ ایک ہی شخص کی ذاتی ملکیت تھا۔ مگر بعد میں سائنیور مسولینی پریسیڈنٹ روزولٹ۔ ونسٹن چرچل۔ جنرل ٹوجو۔ ڈکٹیٹر فرانکو۔ جنرل سموچیانگ کائی شیک اور حضور نظام آصف جاہ نے بھی اس کارخانے میں اپنا اپنا سرمایہ لگایا اور پبلک سیفٹی ریزر کا کاروبار متذکرہ صدر حصہ داروں کی ایک لمیٹڈ کمپنی کے تحت کر دیا گیا (یہاں ان بریکٹ واضح رہے کہ تقسیم ہندوستان کے بعد الحاج خواجہ ناظم الدین اور ہز برہمنک مجسٹی شری چکرورتی راجگوپال اچاریہ نے بھی پاکستان اور ہندوستان کی طرف سے علی الترتیب سرمایہ لگایا) لمیٹڈ کمپنی کے تحت آجانے کے بعد اس کاروبار میں دن چوگنی اور رات دوگنی ترقی ہوتی رہی ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک پبلک سیفٹی ریزر کا کاروبار اتنا منافع بخش اور اس کا استعمال اتنا عالمگیر تھا کہ لوگ باگ گنگ ہو کر رہ گئے تھے۔ پبلک کی فلاح و بہبود کی خاطر حکومتوں نے جگہ جگہ "پبلک شیونگ سیلون" قائم کر رکھے تھے اور ضرورت بے ضرورت ہر اس شخص کو جس نے جنگِ عظیم کی گرانی اور حکومت کے پرائس کنٹرول پلان کو گالی دے کر داڑھی اور مونچھ بڑھائی

چاہی تو فوراً اس شخص کے منہ پر پبلک سیفٹی ریزر پھروا دیا۔ اس کے بعد باربرس اِچ (BARBER'S ITCH) کے خطرے سے بچانے کے لئے اُس شخص کو خشک حمام میں بھیج دیا جاتا۔ خشک حمام آپ کے لئے کوئی نئی قسم کا حمام ہو تو ہو۔ مگر دوسرے سب لوگ جانتے ہیں کہ خشک حمام جیل خانے کی طرح ایک عام عمارت ہوتی ہے۔ جہاں پبلک سیفٹی ریزر کے استعمال کے بعد جانا لازم اور لابد ہو جاتا ہے۔ ورنہ پھر "باربرس اِچ" یعنی فسادخون اور خونی بغاوت کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

گزشتہ جنگِ عظیم کے دوران میں سارے جہان سے اچھے ہندوستان میں این و آں اور ہما شما کا ذکر ہی کیا۔ گاندھی جی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور پورن چند جوشی جیسے جغادری رہنماؤں کی تک اس پبلک سیفٹی ریزر سے کلین شیو کی گئی اور اس تعریف میں نہ صرف یہ رہنما بلکہ اخبار نویس، شاعر اور ادیب بھی بڑے قلابے ملا چکے ہیں چنانچہ اسی موضوع پر ملک کے مشہور ترقی پسند ادیب کامریڈ ابراہام جلبیوف نے ایک ضخیم مجلد سہ رنگا گرد پوش والی کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا "بربریت باربریت ہے"۔ اس کتاب کو ونسٹن چرچل کے نام معنون کیا گیا تھا اور یہ کتاب اتنی پسند کی گئی کہ "برٹش انڈیا باربرس" یونین" کے جنرل سکرٹری مسٹر ویول نے سارا اسٹاک خرید لیا۔ ورنہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتی۔ پچھلی جنگِ عظیم کے دوران میں جب نازی جرمنوں نے سکولوں، ہسپتالوں کے علاوہ لائبریریوں پر بھی بمباری کی۔ تو اس کا سارا اسٹاک جل گیا صرف تین نسخے باقی رہ گئے۔ ایک تو قلمی نسخہ ہے جو لندن میوزیم میں موجود ہے دوسرا

نسخہ پریسیڈنٹ ٹرومین کے پاس ہے۔ تیسرا نسخہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی لائبریری میں تھا لیکن ہندوستان سے جاتے ہوئے مس پامیلا ماؤنٹ بیٹن۔ پنڈت نہرو کا ایک بوسہ اور ابراہام جلیبسوف کی یہ تصنیف بطور یادگار ساتھ لے گئیں۔

ویسے اب اس تصنیف کی قوم کو ضرورت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ ادھر ہندوستان کو برلاڈالمیا اور راجوں، راجواڑوں کے لئے آزاد کراتے ہی پنڈت نہرو کو سرمایہ داری کی بقاو فروغ کی طرف فوراً رجوع کرنا پڑا۔ اور انہوں نے دوسری صنعتوں کو قومی ملکیت بنانے کے وعدوں کو پسِ پشت ڈال کر پبلک سیفٹی ریزر کی صنعت کو قومی ملکیت بنا دیا۔ پبلک سیفٹی ریزر ہندوستان کے خواص میں بالکل نہیں اور عوام میں بہت زیادہ مقبول ہو چکا ہے۔

لیکن ہندوستان کو یوں شاہراہِ ترقی پر گامزن دیکھ کر ہم پاکستانیوں کو قطعاً افسردہ۔ پژمردہ اور آبدیدہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ پاکستان بھی صنعتی لحاظ سے ہندوستان سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ جہاں تک پبلک سیفٹی ریزر کی صنعت کا تعلق ہے۔ پبلک کو میری طرف سے یہ مژدۂ جانفزا ہے کہ ہمارے ایک محترم بزرگ حاجی شیخ حسام الدین صاحب نے بھی اپنے پیارے وطن پاکستان کے لئے پبلک سیفٹی ریزر کی ہول سیل ایجنسی براہِ راست لندن اور نیویارک سے حاصل کی ہے اور ہر بڑے شہر مثلاً لاہور، پشاور، کوئٹہ، ڈھاکہ میں اس کی "سب ایجنسیاں" بھی قائم کر دی ہیں۔ اور ان کے کاروبار کو ماہرانہ انداز میں چلانے کے لئے دیرینہ تجربہ کار ولائتی انگریزوں کی خدمات بھی حاصل

کر لی ہیں۔ آپ مسر ٹوڈی کو تو جانتے ہیں نا؟

سچ پوچھئے تو انگریزوں اور امریکیوں کی مدد کے بغیر ایک پبلک سیفٹی ریزر کا کارخانہ کیا کوئی کارخانہ چل ہی نہیں سکتا۔ ہمارے ملک کے پبلک سیفٹی ریزر کی ساخت اور اس کا مصرف دیکھ کر زبان سے از خود ایک توصیفی شعر نکلتا ہے کہ ؎

واہ میاں انگریز ——— واہ

تو جوانمردوں سے بازی لے گیا

ہمارے وطن سے گیا تو حقِ نمک ادا کر کے گیا۔ یونین جیک لے گیا۔ مگر ٹوٹیڈ کا تھان نہیں لے گیا۔ ٹامیوں کو لے گیا۔ افسروں کو چھوڑ گیا۔ کوہ نور لے گیا۔ تاج واپس دے گیا۔ وائسریگل لاج خالی کر گیا۔ مگر چاندنی چوک اور مال روڈ کی دکانیں خالی نہیں کیں۔ اناج لے گیا۔ بنجر کھیت دے گیا۔ سونا لے گیا۔ کان چھوڑ گیا۔ روح لے گیا۔ جسم چھوڑ گیا۔ لوہا چرا کے لے گیا تو پبلک سیفٹی ریزر بنا کر واپس کر دیا۔

اب یہاں دیسی بھائی غل مچا رہے ہیں کہ وہ ہمارا سب کچھ لوٹ کر لے گیا۔ لیکن کوئی بھی دہلی یا کراچی کے گورنر جنرل کے ڈریسنگ ٹیبل جا کر دیکھے تو وہاں اسے پبلک سیفٹی ریزر نظر آئے گا ——— خالص میڈ اِن لنڈن ——— خالص میڈ اِن نیو یارک ———

پبلک سیفٹی ریزر آج کل ہمارے ملک پاکستان میں اتنا ہر دلعزیز ہے کہ کیا ترجوان اور کیا جوان کیا ادھیڑ اور کیا بوڑھا۔ سب اس سے واقف ہیں۔ گاؤں اور دیہات

کے اُجڈ گنوار لوگ تک اسے جانتے ہیں۔ آپ کسی دیہاتی گنوار سے پوچھیے۔ تو وہ فوراً کہے گا۔

"ارے وُہ کالا ریزر ہے، اوہ جانتا ہوں۔ خوب جانتا ہوں۔"

ادنیٰ اور متوسط طبقے میں تو اُس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہماری مہربان حکومت اس کو مزدوروں اور کسانوں تک میں مفت تقسیم کر رہی ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہماری حکومت اخوت اور مساوات کی بنیادوں پر قائم ہوئی ہے۔

اس سیفٹی ریزر کی جس شخص نے برائی کی تو فوراً تجربتاً اور نمونتاً اس کی زبردستی شیو کی گئی۔ تاکہ اسے پتہ چلے کہ یہ ریزر کیا خوب شیو کرتا ہے۔ اس کو قومی ملکیت بنانے اور عوام میں عام کرنے کی غرض سے نہ صرف خاص خاص شیونگ سیلون بلکہ ان کے علاوہ پولس کے ہر سپاہی کے ڈریس میں لاٹھی، سنگین اور پستول کے ساتھ پبلک سیفٹی ریزر بھی شامل کر دیا گیا ہے اور ہر پولس کے سپاہی کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ جو شخص اس ریزر یا ریزر کے سارے کارخانے کے خلاف کچھ کہے۔ اسے پکڑ کر حقہ کا پانی استعمال کیے بغیر اُس کی داڑھی مونچھ مونڈھ دو۔

چنانچہ آج کل پبلک سیفٹی ریزر گورنمنٹ کنٹرول ریٹ پر بلا سیل ٹیکس پولس کے ہر سپاہی سے بآسانی دستیاب ہو سکتا ہے۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ ہوتا ہے دفعہ سات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ٹریڈ مارک کے لئے یاد رکھیے کہ پبلک سیفٹی ریزر کی بلیڈ ہالو گراؤنڈ اور شارپ ایج ہوتی ہے۔

میں ذاتی طور پہ ابھی تک اس مشہور و معروف ریزر کو استعمال نہیں کر سکا لیکن
میرے چند ساتھیوں سجاد ظہیر، مرزا محمد ابراہیم، ایرک سپرن، چودھری اسلم، مخدوم محی الدین
محمد حسن عطا، فیروز الدین منصور اور علی سردار جعفری کی رائے یہ ہے۔ یہ ایک انتہائی
مضر جسم و جاں، خوں چکاں اور خوں فشاں ریزر ہے۔ ان لوگوں نے یہاں تک بھی
کہہ دیا کہ خدا دشمن تو دشمن ہر انسان کو اس کے چرکوں سے محفوظ رکھے۔ لیکن مجھے ان
لوگوں کی باتوں پر اس لیے یقین نہیں ہے کہ سنی سنائی باتوں کا میں قائل نہیں۔ البتہ میں
نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اس کے شیو کے وقت تکلیف بہت ہوتی ہے۔ میرا
ایک چشم دید واقعہ ہے۔ کچھ دنوں پہلے مال روڈ پر سے ایک شخص گزر رہا تھا۔ اچانک
اس کا پاؤں کیلے کے چھلکے پر سے پھسل گیا اور وہ دھڑام سے گر پڑا۔ اٹھ کر کھڑے
ہوتے ہوئے اور اپنی خفت کو ایک بھرپور گالی سے مٹانے کے لیے اس نے کہا۔

"اس سالی پاکستان میونسپل کارپوریشن کی ایسی تیسی"

ایک پولس کے سپاہی کی ایسی تیسی نے یعنی حس سماعت نے یہ گالی سن لی اور
وہیں فٹ پاتھ پر اسے پکڑ لیا کہ تم ففتھ کالمسٹ ہو یعنی قابل حجامت ہو۔ پھر اس کے
بعد اس نے یہ ایک سیفٹی ریزر نکالا اور پھر یارو دیکھو اسے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ کہ
اس سپاہی نے اس بیچارے کے وہ چرکے لگائے کہ اب وہ شخص کسی کو صورت
نہیں دکھاتا۔ سنا ہے کہ اسے "باربرس اچ" ہو گیا ہے اور حکومت اس کا ہسپتال کی
بجائے شاہی قلعے میں معقول علاج کر رہی ہے۔

پولس کے ایک ذمہ دار افسر نے مجھے ایک بار یہ بھی بتایا کہ آج کل پولس کے سپاہیوں کی یہ ایک لازمی ڈیوٹی ہے۔ ان کے افسر ہر ڈیوٹی شفٹ پر نہ صرف یہ سوالات کرتے ہیں کہ

کتنی سائیکلیں بلا نمبر کے پکڑی گئیں؟

کتنے تانگے بلا نمبر کے دھر لئے گئے؟

کتنے جیب کترے گرفتار کئے گئے؟

بلکہ یہ سوال بھی پوچھتے ہیں کہ

آج پبلک سیفٹی ریزر سے کتنے لوگوں کی حجامت کی گئی؟

اس ضمن میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ مجھے مولوی عمر دراز خاں صاحب سے کل ہی سُنا کہ کل ایک سپاہی بڑا پریشان پھر رہا تھا۔ کیونکہ اُس کی ڈیوٹی شفٹ ختم ہو چکی تھی۔ مگر نہ تو کوئی بلا لیمپ کی سائیکل اور نہ کوئی بلا نمبر کا تانگہ اور نہ کوئی جیب کترا پکڑا گیا اور نہ کسی کی پبلک سیفٹی ریزر سے شیو بنائی جا سکی تھی۔ تنگ آ کر اُس نے راستہ چلتے چلتے مولوی نصیب دراز خاں کو دھر لیا اور سیدھے مجسٹریٹ کے روبرو لے گیا۔ نصیب دراز خاں بیچارے شریف آدمی بڑے پریشان ہوئے کہ معاملہ کیا ہے۔ مجسٹریٹ نے جب ان کے ہونٹوں کے اوپری حصے اور ٹھوڑی پر غور سے دیکھا تو نصیب دراز خاں نہ صرف معاملہ سمجھ گئے بلکہ معاملہ کی تہ تک پہنچ گئے اور عرض کیا

"حضور ـــــ ابھی تو مجھے شیو کی ضرورت نہیں"۔

مجسٹریٹ نے برافروختہ ہو کر کہا

"تو پھر کیا گورنمنٹ انتظار کرے گی ۔۔۔!"

مولوی عمر دراز خاں صاحب یہ بھی بتا رہے تھے کہ بیچارے نصیب دراز خاں کو ایسا گھناؤنا باربرس اچ (BARBER'S ITCH) ہو گیا۔ کہ ان کی صورت دیکھی تک نہیں جا سکتی۔

مگر جانے کیا بات ہے ؟ مجھے اس واقعہ کے باوجود نصیب دراز خاں صاحب کی بات پر یقین نہیں آتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دُنیا کے بہت سے شہرہ آفاق ادیبوں اور شاعروں نے پبلک سیفٹی ریزر کی تعریف میں مضامین اور نظمیں تو کیا کتابیں تک لکھ ڈالیں۔ چنانچہ حال ہی میں مَیں نے سومرسٹ ماہم کی مشہور کتاب The Razor's Edge بھی پڑھی ہے اور اس کی فلم بھی دیکھی ہے۔

اور تو اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جس جس مُلک میں پبلک سیفٹی ریزر کے کارخانے قائم ہیں۔ اس کارخانے کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے لئے دُنیا کے بہترین دماغوں اور بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے شعبہ ہائے تشہیر میں ملازم چند ادیبوں اور شاعروں کے نام تو میں بھی جانتا ہوں۔ مثلاً آندرے ژیدڈی۔ ایچ لارنس۔ سومرسٹ ماہم۔ آندرے مالو۔ جیمس جوائس۔ پروسٹ۔ بوڈلیر۔ لن یوتانگ وغیرہ۔

اور یہاں اپنے ملک پاکستان کے بہت سے مشہور ادیب بھی پبلک سیفٹی ریزر فیکٹری

ہی کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر شہتیر۔ شیخ محسن قہقہری۔ انتباز حسین
ایم۔ اکرم۔ شاعر المادری۔ ہنگامہ کاشغری۔ بابو سلام محمد جبٹ امرتسری (جو پہلے فالینول
کی تجارت کرتے تھے) وغیرہ وغیرہ۔ اور ہاں میں تو پروفیسر امجد علی کا نام ہی بھول گیا۔
ابھی کچھ دنوں پہلے کی بات ہے۔ ملک کے مشہور رسالے "دی سیلون منتھلی" میں پروفیسر
امجد علی کا ایک انگریزی قصیدہ پبلک سیفٹی ریزر کی تقریب میں پڑھا تھا۔ جو فن کا اعلیٰ ترین
نمونہ ہے اور ترقی پسند ادیبوں کے منہ پر ایک طمانچہ ہے اور ادب برائے ادب
میں زندہ جاوید رہے گا۔

پبلک کے فائدے اور ذاتی ثواب کمانے کی خاطر میں یہ قصیدہ مفت سناتا ہوں
سُنئے اور سر دُھنئے۔ فرماتے ہیں۔

Shaving starts the Daily Round

Choose a blade that tripple ground

Sharp, then sharper, sharpest yet

Public Safety Razor the one to get

If you start the morning right

Smooth of cheek your face the night

When the music weans its spell

Use Public Safety Razor - - - and all is well

ہائے افسوس نہ ہوئیں مادام میبل ولسن اس وقت۔ ورنہ وُہ یہ نظم گا کر سُناتیں
یا اگر میں خود چھ سال کی عمر میں لندن جانے کے بجائے اب جاتا تو لگے ہاتھوں اس کی
ٹیون بھی ضرور سیکھ آتا۔ آپ گاتا اور آپ کو محظوظ کرتا

مگر مقامِ حیرت دوسری بار پھر آتا ہے کہ ایک طرف تو ہمارے بڑے بڑے
ادیبوں اور شاعروں کی زبانیں پبلک سیفٹی ریزر کی تعریف کرتے کرتے سوکھی جا رہی
ہیں تو دوسری طرف ترقی پسند ادیب اور شاعر شور مچا رہے ہیں کہ یہ ریزر پبلک کی
سیفٹی کے نام پر پبلک کلامیٹی کا باعث بنا ہوا ہے۔ ان لوگوں نے اس کا نام پبلک
کلامیٹی ریزر (CALAMITY RAZOR) رکھا ہوا ہے۔ وُہ حکومت
سے احتجاج، مطالبے اور اپیلیں کر رہے ہیں کہ اس پبلک کلامیٹی ریزر کو منسوخ کرو
اور اسے ممنوع قرار دو ــــ مگر صاحب میں خوب جانتا ہوں کہ یہ محض شرارت ہے۔
میری دور بینی اور ژرف نگاہی کی داد دیجیے کہ میں نے دیکھ لیا ہے کہ یہ شرارت بھی کمیونزم
کی طرح ماسکو ہی سے آئی ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہماری حکومت جہاں کسی
شخص کو دیکھتی ہے کہ وُہ مارکسی ڈاڑھی یا اسٹالینی مونچھیں پال رہا ہے تو فوراً اس کا
صفاچٹ کرا دیتی ہے۔ تاکہ کہیں کمیونزم نہ پھیل جائے۔ اپنے اس اسلامی ملک میں

بھلا کمیونزم کی لعنت کو کیسے جگہ مل سکتی ہے۔

میں تو کہتا ہوں کہ حکومت بہت اچھا کر رہی ہے۔ کیونکہ یہ اسٹالینی مونچھیں اور مارکسی داڑھی دونوں دنیا اور انسانیت کے لئے بڑی خطرناک ہیں۔ اب یہی دیکھئے کہ زار روس نے مارکسی داڑھی اور اسٹالینی مونچھوں سے ذراسی غفلت برتی اور نتیجہ یہ نکلا کہ آج زار کا روس بھی بابل و نینوا کی طرح صفحۂ تاریخ سے غائب ہو گیا۔

سمجھ دار حکومتیں فوراً عبرت پکڑتی ہیں۔ چنانچہ ہماری حکومت نے بھی فوراً عبرت پکڑی جس کے شاندار نتائج ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں کہ اب اسٹالینی مونچھیں اور مارکسی داڑھی کہیں نظر ہی نہیں آتی۔ جدھر دیکھو ادھر بس ہٹلر کٹ ہی ہٹلر کٹ نظر آتی ہے۔

اب ایک کمیونزم کیا۔ چار کمیونزم لاؤ۔ ۱۹۴۵ء میں ہٹلر نے کمیونزم کو صرف سیاسی شکست دی تھی۔ اب کے تو وہ کمیونزم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر رکھ دے گا ہٹلر کٹ کوئی معمولی کٹ نہیں ہوتا اور پھر فرعونِ مصر نے دنیا کے سارے حکمرانوں کے لئے مرنے سے پہلے بڑی کارآمد وصیت چھوڑی ہے کہ حکومت کرنا چاہتے ہو تو عوام کی حجامت کرو۔ "حکومت برائے حجامت" یہی رموزِ مملکت ہیں اور یہی پیشۂ خسرواں۔ یہی طور و طریق سلطانی ہیں۔ یہی آئینِ جہانگیری اور اندازِ جہاں بانی ہیں۔ جب تک دنیا میں رہو۔ خوب حکومت کرو اور خوب حجامت کرو۔ البتہ مارکسی داڑھی اور اسٹالینی مونچھوں والی شوخ کمیونزم سے ضرور ڈرتے رہا کرو۔ کیونکہ میں نے

اپنی زندگی میں اسی بارے میں بارہا استخارہ کیا ہے اور جواب میں ہر بار آسمانوں سے یہ شعر نازل ہوتا رہا کہ ؎

اُس شوخ کے کوچے میں نہ جایا کرو حجام
چھن جائیں گے اک روز یہ اوزار تمہارے

بغیر اجازت کوئی نہ چھاپے

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد ز سرا پردۂ تقدیر پدید

این کتاب مستطاب

موسوم بہ

الفت میں غفلت

تالیف لطیف

منشی ابراھیم جلیس

شائع کردہ
سیٹھ آدم جی شیطان جی بریلی والے بانسول والے
متصل درگاہ پیر مفت خور۔ لنڈا بازار چھانگا مانگا

[illegible] پریس سے چھپ کر سیٹھ آدم جی شیطان جی کے پاس سے شائع ہوا

دیباچہ

سپاسِ بے قیاس حضرتِ خالقِ دوجہاں کو لائق سزاوار ہے۔ جس نے دو حرف کاف اور نون سے جملہ کائنات کو مرتب فرمایا، ایک اشارہ میں دو جہاں کو عدم سے وجود میں لایا۔ شاہدِ سخن کو وہ حسنِ دلفریب عنایت کیا جس کے جانفزا کرشموں نے ایک عالم کو دیوانہ بنا دیا، ایسے خالقِ مطلق کی حمد و ثنا کس زبان سے بیان ہو۔ قلمِ شکستہ رقم ایسے مقام پر کیوں نہ سرگرداں ہوے

زبانِ قلم میں یہ قدرت کہاں
جو ہو حمدِ خالق میں گوہر فشاں

اما بعد! مسلمانوں کو سلام اور ہندوؤں کو رام رام

پیارے ناظرین ـــــ کمترین ہیچمدان ابراہیم جلیس بی اے (علیگ) نے محض بلحاظِ

فائدہ خاص و عام یہ ناول تصنیف کیا ہے۔ میں نہ تو کوئی مشہور ناولسٹ ہوں اور نہ مجھے ناول لکھنے کا چنداں شوق ہے۔ مگر قوم کے چند خاندانوں کو اس بری بلا کے ہاتھوں تباہ ہوتے، و اہالیانِ خاندان کو انواع و اقسام کی تکالیف اٹھاتے اور حادثاتِ عظیم و سانحاتِ سخت کا مقابلہ کرتے دیکھ کر یہ چھوٹا سا ناول لکھ کر اصحابِ قوم کے روبرو رکھ دیا ہے۔ تاکہ خواص خصوصاً اور عوام عموماً اس سے فائدہ اٹھائیں۔ یہ ناول اگر پیارے ناظرین کو پسند آوے تو وہ مجھ حقیر فقیر پُر تقصیر محمد نصیر کو دعائے خیر سے یاد فرماویں اور اگر سہو و خطا پاویں تو عفو فرما دیں، ہدفِ ملامت نہ بناویں۔ کہ انسان کو سہو و خطا سے چارہ نہیں۔ واللہ المعین حسبی ما نستعین ؂

خیر خواہِ قوم

منشی ابراھیم جلیس عفی عنہ

مورخہ یکم جنوری سنہ ۱۹۴۹ء

۹/۵ ایبٹ روڈ، شہر لاہور ـــــ در حکومتِ پاکستان

بابِ اوّل

اے قلم کر دیر مت جلدی اُٹھا تو اپنا سر
صفحۂ قرطاس پر دکھلا ابھی اپنا ہنر
اس طرح کاکر رقم مضمون اس ناول کا چُست
پُورا پُورا دل پہ ہر اک کے پڑے جس کا اثر

ناولسٹ :- آئیے پیارے ناظرین! میرے ساتھ آئیے!

[ناظرین، ناولسٹ کی آواز پر لبیک کہہ کر اس کی طرف جاتے ہیں۔ ناظرین میں بالعموم وہ لوگ جو گھروں میں بیکار بیٹھے وقت گزاری کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ ناولسٹ صاحب نے بلایا تو انہیں بڑی خوشی ہوئی

کہ چلو ذرا وقت اچھا گزرے گا۔ ایسے ناظرین کے علاوہ، بستر بیماری پر لیٹے ہوئے بیمار، لمبے سفر پر جانے والے مسافر، چھٹیاں منانے والے طالب علم دوکانوں پر بیٹھنے والے سیٹھ، امیر آدمیوں کی نوجوان لڑکیاں، بڑے آدمیوں کی بیویاں، اور قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھنے والے بوڑھے بھی ناولسٹ صاحب کے ساتھ ہیں۔ ان میں ایک ناظر جس کا نام جلبسوف ہے، بات بات پر ناولسٹ صاحب سے اُلجھ پڑتا ہے]

ناولسٹ:- پیارے ناظرین! یہ شہر "عشق پور" ہے۔ اس شہر کے بیچوں بیچ جو کالی کوٹھی نظر آرہی ہے۔ چلئے اس میں چلیں۔

جلبیسوف:- وہ کوٹھی تو بہت دور ہے۔ کسی نزدیک کی کوٹھی میں چلئے۔

ناولسٹ:- دیکھو میاں صاحبزادے! اگر تم کو ناول پڑھنا مقصود نہ ہو۔ تو تم ہنٹنگ نہ آؤ۔ دوسرے ناظرین چلیں گے۔ کیوں پیارے ناظرین!

پیارے ناظرین (بہ یک زبان ہو کر) ہاں ہاں! تمہارا جی نہیں چاہتا، تو تم مت آؤ۔ ہم تو ناولسٹ صاحب کے ساتھ ضرور جائیں گے۔ چاہے ناولسٹ صاحب ناول کا چکمہ دے کر ہمیں دوزخ ہی میں کیوں نہ جھونک دیں۔ ہم اگر واقعی مخلص اور پیارے ناظرین ہیں تو ہم کو بہر قیمت، ناولسٹ صاحب کا حکم بھی ماننا پڑے گا، چلئے ناولسٹ صاحب!

ناولسٹ:- ہاں! بسم اللہ! چلئے!

جلیسوف:۔ (قدرے سوچ کر) ارے ٹھہریئے ٹھہریئے! میں بھی چلتا ہوں۔ بھلا ابکا گھر بیٹھ کر کیا مکھیاں ماروں گا۔ میں نے ابھی اڑھائی روپے خرچ کر کے ناول خریدا ہے اور وہ اڑھائی روپے خالص حلال کی کمائی ہے صاحب!

ناولسٹ:۔ اچھا، اب آپ بکواس کر کے میرا اور دوسرے ناظرین کا وقت خراب نہ کیجئے۔ چلنا ہے تو جلدی چلیئے۔ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔

[ناولسٹ صاحب کے پیچھے ناظرین کا ہجوم چلا جا رہا ہے۔ بالآخر سب اس تین منزلہ کالی کوٹھی پر پہنچتے ہیں۔ دروازے پر پہنچ کر ناولسٹ صاحب ناظرین سے فرماتے ہیں]

ناولسٹ:۔ پیارے ناظرین! اب آپ لوگ اپنے اپنے جوتے نکال کر بغل میں داب لیجئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پیروں کی چاپ سے کوئی ہمیں دیکھ لے اور چور سمجھ کر ہمیں مارے پیٹے اور پولیس کے حوالے کر دے۔

[سارے ناظرین اپنے اپنے جوتے بغل میں داب کر ناولسٹ کے پیچھے پیچھے دبے پاؤں چوروں کی طرح داخل ہوتے ہیں۔ ایک کمرے کے کونے میں پہنچ کر ناولسٹ صاحب سارے ناظرین کو ایک قطار میں بٹھا دیتے ہیں۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک پلنگ بچھا ہوا ہے اور پلنگ پر ایک نوجوان لیٹا ہوا ہے اور بار بار آہیں بھرتا ہے۔ کبھی اٹھ بیٹھتا ہے کبھی دھڑام سے تکیئے پر اپنا سر ٹپک دیتا ہے، کبھی ایک منٹ میں دس

کروٹ بدلتا ہے اور کبھی دھیرے دھیرے رونے لگتا ہے، جب کبھی ایک منٹ کے لئے بھی سکون میسر آتا ہے تو اپنے سر کے بال نوچ کر بابو مداری لال گوہر کی یہ غزل گاتا ہے :-

غزل

مری آنکھ جس دن سے اس سے لڑی ہے
گزرتی مصیبت سے اک اک گھڑی ہے
کہاں تک کروں صبر ہجرِ صنم میں
ہزاروں طرح کی مصیبت پڑی ہے
دِلا! تجھ کو شکوہ ہے ناحق بتوں سے
دغا ان کو کرنے کی عادت پڑی ہے
کبھی عشق سے تم نہ واقف تھے گوہر
نئی تم پہ آکر یہ آفت پڑی ہے

غزل گا کر بعد بسترِ عشق پر گر کر ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگتا ہے۔

ناولسٹ صاحب ناظرین سے پوچھتے ہیں ؟

ناولسٹ :- پیارے ناظرین! اب تو آپ اس آدمی کو پہچان گئے ہوں گے؟

ناظرین :- نہیں تو!

جلیبوف :- ناولسٹ صاحب! میں پہچان گیا۔ یہ کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے یا مرگی کا مریض!

ناولسٹ:۔ لاحول ولا! تمہاری عقل پر پڑیں پتھر! ارے میاں یہ تو عاشق ہے۔

جلیسوف:۔ تو پھر کیا ہوا؟ پاگل اور عاشق میں فرق ہی کیا ہوتا ہے؟

ناولسٹ:۔ میری توبہ قبول ہو، کہاں عاشق اور کہاں پاگل؟۔ کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو۔

جلیسوف۔ بیوقوفی کا مذکور! اجی قبلہ میرزا غالب مرحوم نے کیا خوب فرمایا تھا:۔

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

ناولسٹ: اُف فوہ! تم پر اور تمہارے میرزا غالب مرحوم پر خدا کی پھٹکار۔ بھئی، بس! اب تم چپ رہو ۔۔ ہاں تو دیگر پیارے ناظرین! یہ نوجوان مرضِ عشق میں مبتلا ہے۔ نہیں معلوم وہ کون ماہ پارا عشوہ طراز حسینہ ہے جس کے عشق میں بیچارے کا یہ حال ہے۔ آیئے، اب اس حسینہ کا پتہ لگایا جائے۔

جلیسوف۔ نہیں ناولسٹ صاحب! اس حسینہ کے پاس ہمیں نہ لے چلیئے۔ اگر اس کو دیکھ کر مجھ پر اور سارے ناظرین پر پاگل پن کے ایسے ہی دورے پڑنے لگے، تب؟

[ناولسٹ صاحب کے جواب دینے سے پہلے قدموں کی آہٹ ہوتی ہے اور ناولسٹ صاحب ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سارے ناظرین کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہیں، کوئی نووارد آتا ہے اور اس نوجوان عاشق کے پلنگ کے قریب کرسی پر بیٹھ کر پوچھتا ہے]

نووارد :- سناؤ بھئی عبدالقادر --- کیا حال ہے یہ تمہارا ؟

عبدالقادر :- کچھ نہ پوچھو، بھئی رحمان خاں ! ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ

اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

رحمان خان :- اخاہ ! تو آپ مریضِ محبت ہیں !

ع مریضِ عشق پر رحمت خدا کی

اچھا ! بتاؤ تو وہ کون ہے ماہ لقا ستمگر، جس نے میرے دوست کا یہ حال کر دیا۔ ممکن ہے میں تمہاری کچھ مدد کر دوں !

عبدالقادر :- کیا پوچھتے ہو رحمان خاں ! وہ کون ہے، وہ محکمہ آبکاری کے محرر عثمان خان کی بیٹی رحمت بی بی ہے۔

رحمان خان :- (دونوں ہاتھوں سے دل تھام کر) اچھا وہ رحمت بی بی جس کے حسن و جمال کا شہرہ ادھر راولپنڈی سے اُدھر لنڈی کوتل تک پھیلا ہوا ہے۔ ہائے ہائے ! اچھا بھئی ! تمہاری اور اُس کی آنکھ کیسے لڑ گئی ؟

عبدالقادر :- بھائی ! میرے دل میں بہت درد ہو رہا ہے۔ درد کم ہو تو عشق کی کہانی سناؤں !

[رحمان خاں اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ادھر اُدھر دیکھ کر ایک شربت انار کا شیشہ نکال کر لاتا ہے اور عبدالقادر کو پلا دیتا ہے۔ شربتِ انار پی کر زبان سے

ہونٹ چاٹتے ہوئے اپنے عشق کی کہانی شروع کرتا ہے]

عبدالقادر:- اب سنو ماجرائے دردِ دل! کل شام میں اپنی بیٹھک میں بیٹھا، ہاتھ پاؤں کے ناخن تراش رہا تھا کہ ایک بوڑھی عورت آئی اور مجھ سے کہا: "بیٹا! ہمارا ایک کام ہے اگر اللہ واسطے کر دو تو زہے نصیب"۔۔۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا: "بسر و چشم حاضر ہوں۔ فرمائیے کیا کام ہے؟" بوڑھی بولی: "بیٹا مجھے ایک خط دہلی لکھوانا ہے۔ اگر بارِ خاطر نہ گزرے تو ذرا میرے ہمراہ آؤ۔ اور میرے گھر تک چلنے کی تکلیف گوارا کرو"۔۔۔ میں نے کہا: "لائیے میں یہیں لکھ دوں"۔۔۔ اس نے کہا: "بیٹا! مجھ سے نہیں لکھوایا جائے گا، میری ایک لڑکی ہے، وہ خود لکھوائے گی۔ کیونکہ میرے حواس اس قابل نہیں ہیں کہ خط لکھواؤں"۔ یہ سن کر میں فوراً اس بڑھیا کے ساتھ ہو لیا۔ وہ ایک تنگ کوچہ میں ہو کر مجھے ساتھ لے گئی اور ایک مکان کے دروازے پر مجھے کھڑا کر دیا جس کا رخ شمال کی طرف تھا۔ بعد ایک لمحے کے مکان کے اندر لے گئی اور ایک کرسی دالان میں بچھا کر مجھ سے کہا، تشریف رکھیئے! میں مشرق کی طرف منہ کر کے پاؤں پر پاؤں رکھ کر بیٹھ گیا اور خط لکھوانے والی کا انتظار کرنے لگا کہ خدایا! دیکھئے کیا گل کھلتا ہے۔ اسی پس و پیش میں تھا کہ سامنے کو دیکھتا ہوں کہ جنوبی دیوار میں ایک کھڑکی کھلی جس میں سے ایک کم سن حسین نزاکت سے بھری ہوئی آواز آئی:-

"اے بوا! یہ پان تو لے جاؤ!

میں نے جو اس کی گوری گوری انگلیاں دیکھیں تو بس بے ساختہ اپنا دل کھو بیٹھا اور میرا بدن سنسنانے لگا۔ اس کا رعبِ حسن کچھ مجھ پر ایسا چھایا کہ خط لکھنا دوبھر ہو گیا تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ بوڑھیا میرے بشرے کو دیکھ کر تاڑ گئی ؎

ہوتے آتش کے ہیں یہ پرکالے

تاڑ جاتے ہیں ـــــ تاڑنے والے

اور وہ بولی۔ اے میاں! جو اس وقت تمہاری حالت ہے۔ وہی ہماری بی بی کی ہے۔ تم تو آج اس پر عاشق ہوئے ہو۔ وہ تو تم پر چار دن پہلے، یعنی اتوار کے روز تم پر عاشق ہوئی ہے۔ جانتے نہیں ؏

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود

میں نے کہا۔ "اچھا! یہ بات ہے، مگر مجھے یقین نہیں آتا۔"

میرے استفسار کا جواب بڑھیا کی بجائے اس حسینہ نے دیا۔

حسینہ۔ میرے پیارے! تمہیں یقین نہیں آتا تو ایک چھری لاؤ، ایک خنجر لاؤ، ایک کٹاری لاؤ، اور میرا سینہ چیر کر دیکھو کہ میرے دل میں تمہاری محبت کس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ؎

ہجر میں میں تمہارے روتی ہوں

بے کلی سے میں جان کھوتی ہوں

جب سے تمہاری بھولی بھالی صورت دیکھی ہے، میرا کھانا پینا سب حرام ہو گیا ہے

سوتے، اُٹھتے، بیٹھتے، ہر دم آپ کا خیال آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پر لگا کر اُڑ جاؤں اور آپ کی گود میں بیٹھ جاؤں ؎

دو پر تو کیا بھلے، ہوتے اگر دو ہزار پر
پروانہ کر نثار شمع پہ سارے نثار پر

ہائے ہائے، اوئی اللہ! اے محبت! تو نے مجھے دو جہاں سے غافل کر دیا ؎

کہاں لے جاؤں دل، دونوں جہاں میں سخت مشکل ہے
اِدھر پریوں کا مجمع ہے، اُدھر حوروں کی محفل ہے

[جلیسوف :۔ (ناولسٹ صاحب کے کان میں) ارے بھائی ناولسٹ صاحب! یہ عجیب عورت ہے، اس کو شعر کا محلِ استعمال بھی تو نہیں معلوم! یہ شعر تو مرد پڑھا کرتے ہیں حسینہ پر آخر کیا آپڑے گی؟ یہاں پریوں کا مجمع اور وہاں حوروں کی محفل — دونوں جگہ اُسی کی پارٹی کے تو لوگ ہوں گے۔ یہ تو بڑے مزے کی .....

ناولسٹ :۔ آپ بہت غنڈے ہیں، خاموش رہیئے! یا پھر یہاں سے نکل جایئے!

جلیسوف :۔ معاف فرمایئے! یہ دھمکی کسی اور کو دیجئے۔ میں نے اڑھائی روپیہ دے کر ناول خریدا ہے، روپے واپس دیجئے اور ناول لے لیجئے۔

ناولسٹ :۔ ہمارا اصول یہ ہے کہ ایک بار خریدی ہوئی اشیا واپس نہیں لی جاسکتیں ....

دوسرے ناظرین :۔ ارے بھئی! آپ لوگ بھی عجیب جھگڑالو ہیں۔ آپ لوگ اُدھر

جھگڑتے رہ گئے اور اُدھر ہیرو نے ہیروئن کا پیار لے لیا۔
جلیسوف اور ناولسٹ (بہ یک زبان جو ہونٹوں پر پھیر رہی ہے) کیا کہا ؟ ہیرو نے
ہیروئن کا پیار لے لیا — یعنی اس عبدالقادر کے بچے نے . . . .
دوسرے ناظرین :- یارو! ان کی باتیں تو سُنو]
عبدالقادر :- کیا آپ اپنے معشوقانہ لہجہ میں اپنا میٹھا نام بتا سکتی ہیں ؟
ہیروئن ۔ آپ کی لونڈی کو رحمت بی بی کہتے ہیں۔
عبدالقادر :- کون ہیں وہ بدتمیز جو آپ کو لونڈی کہتے ہیں۔ ذرا نام تو بتایئے ان حرامزادوں
کا، ابھی ان کے حلق سے زبان کھینچ لوں۔
رحمت بی بی :- (ادا سے مسکرا کر) پیارے آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ میں نے ایک طریقے
شائستگی سے اپنا نام بتایا تھا یعنی میرا نام رحمت بی بی ہے۔
عبدالقادر :- رحمت بی بی — ہا ہا کیا پیارا نام ہے، کیا میٹھا نام ہے، کیا مزے دار
نام ہے۔ رحمت بی بی — رحمت بی بی — رحمت بی بی . . . .
رحمت بی بی :- ارے آپ تو میرے نام کا وظیفہ پڑھنے لگے۔
(قبل اس کے عبدالقادر کچھ کہتے، بڑھیا گھبرائی ہوئی آتی ہے اور کہتی ہے)
بڑھیا :- رحمت بی بی ! رحمت بی بی ! اندر چلی جا۔ تیرے ابا آرہے ہیں۔
رحمت بی بی :- (آنکھوں میں آنسو بھر کر) ہائے میرے پیارے ! ابا کو بھی اسی وقت
آنا تھا، خیر خدا کی یہی مرضی ہے۔ اب جاؤ پیارے عبدالقادر تمہاری جانِ تمنا

تمہیں سلام کہتی ہے۔ مگر کل ضرور میرے غریب خانے کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے معزّز و ممتاز فرمائیو!

عبدالقادر:۔ انشاء اللہ! والمستعان!

یہ قصہ سنا کر عبدالقادر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو جاتا ہے اور اس کا دوست رحمان خان بڑی حسرت سے کہتا ہے:۔

رحمان خان:۔ اچھا تو یہ تھی تمہاری داستانِ عشق!

عبدالقادر:۔ (تکیہ پر سر پٹک کر) ہاں یہی ہے، بالکل یہی ہے، لفظ بہ لفظ یہی ہے۔ میرے جانی دوست! اب میری مدد کرو۔ ورنہ ابھی میں مر جاؤں گا۔

رحمان خان:۔ اچھا اس وقت تو مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ میں گھر جا کر کھانا کھا کر حقہ پیتے ہوئے وصالِ محبوب کی کوئی مناسب سبیل سوچوں گا۔ فی الحال خدا حافظ!

عبدالقادر:۔ خدا حافظ! مگر خدارا جلدی صورت دکھائیو!

ناولسٹ:۔ آئیے ناظرین! اب ہم بھی چلیں۔ بڑی دیر سے یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔ باہر نکل کر تازہ ہوا میں کچھ چائے، پانی، سوڈا، لیمن بٹیں۔ پان سگریٹ سے تازہ دم ہو جائیں۔ کیونکہ اب تھوڑی دیر بعد ہمیں ہماری ہیروئن رحمت بی بی کے گھر جانا ہے۔

[ناولسٹ اور ناظرین دبے پاؤں کالی کوٹھی سے باہر نکل آتے ہیں]

باب دوم

ناولسٹ :- پیارے ناظرین! اب آپ چائے، پان، سگریٹ سے تازہ دم ہو گئے ہوں گے۔ آیئے اب آپ ہماری ہیروئن یعنی رحمت بی بی کے گھر چلیں اور دیکھیں کہ بیچاری کا کیا حال ہے؟

جلیسوف :- مگر ناولسٹ صاحب! رحمت بی بی تو ایک پردہ نشین خاتون ہے، ہم اس کے گھر کے اندر کیسے جا سکتے ہیں؟

ناولسٹ :- میاں تم ابھی بچے ہو، اور میں ابھی ناولسٹ ہوں۔ ناولسٹ کے سامنے کس شریف خاتون کی مجال ہے کہ پردہ کرے۔ دنیا کی ہر عورت ناولسٹ کے آگے مجبور اور بے بس ہوتی ہے۔ وہ جو کہے گا۔ عورت کو ماننا ہی پڑے گا۔ اس لئے تم بحث مباحثہ نہ کرو۔ چپ چاپ میرے ساتھ چلے آؤ اور ہاں پہلے دل و جگر تھام لو کہ ہم اس حسینہ کے گھر جا رہے ہیں جس کے حسن و جمال کا شہرہ اِدھر راولپنڈی سے اُدھر لنڈی کوتل تک پھیلا ہوا ہے۔

[ناظرین اپنے اپنے ہاتھ دل و جگر پر رکھتے، دبے دبے پاؤں ناولسٹ کے پیچھے جاتے ہیں۔ رحمت بی بی کے گھر آتے ہیں اور

ناولسٹ معہ ناظرین دبے دبے پاؤں اس کے کمرے میں پہنچ کر ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ سامنے ایک مسہری ہے۔ جس پر رحمت بی بی آزارِ عشق میں مبتلا ایک سیکنڈ میں ایک ہی کروٹ بدل رہی ہے۔ اس کے پاس اس کی ہمراز سہیلی چاندنی بی بیٹھی ہوئی ہے اور اس سے کچھ پوچھ رہی ہے]

چاندنی بی :۔ کیا بات ہے یہ رحمت بی بی ؟ ؎

تمہاری شکل سے رحمت ہے ثابت
کسی کو تم نے بے شک دل دیا ہے

رحمت بی بی :۔ (شعر کا جواب شعر میں دیتی ہے)

پوچھتی کیا ہو حقیقت مری بے تابی کی
آؤ میں تم کو کلیجے سے لگا لوں تو کہوں

اس کے بعد رحمت بی بی، چاندنی بی کو سینے سے لگا لیتی ہے اور پھر اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے کہتی ہے ؎

میں کیا بتاؤں آپ کو غم کی کہانی ! آہ !
عشقِ بتاں نے لوٹ لی میری جوانی ! آہ !

اور اب

پیچ پر پیچ پڑا کاکلِ پیچاں کی طرح
حال ابتر ہے مرا زلفِ پریشاں کی طرح

چاندنی بی :- مگر یہ تو بتاؤ کہ تمہارا دل کس پر آیا اور تم کو کس نے دل دیا؟
رحمت بی بی :- بہین جس کے ہجر میں رہتی ہوں رات دن، اس کا نام ہے عبدالقادر
چاندنی بی :- وہی عبدالقادر جو تاجر کتب ہے؟
رحمت بی بی :- ہاں وہی تاجر کتب عبدالقادر! پیاری چاندنی بی اللہ قسم، نہ معلوم انہوں نے میرے دل پر کون سا منتر چھو کر دیا ہے کہ میرا دل پہلو سے نکل گیا ہے۔ اب میرا دل اُن کی جدائی کے صدمے کو نہیں برداشت کرے گا۔ اس لئے میں ان کے ہجر میں بابو ڈی، این، مدھوک کا یہ گیت گاتی ہوں۔
چاندنی بی :- ہاں، تم گاؤ، میں میز پر طبلہ بجاتی ہوں۔

گانا

انکھیاں ملا کے، جیا بھرما کے، چلے نہیں جانا
او۔ او۔ او۔ چلے نہیں جانا

گیت ختم کر کے رحمت بی بی، چاندنی بی سے پوچھتی ہے :-
رحمت بی بی :- کوئی ایسی تدبیر نکالو کہ عشق میں وصال ہو، طبیعت بحال ہو۔
(یہ کہہ کر رحمت بی بی پر "عشق کا دورہ" پڑتا ہے اور وہ بیہوش ہو جاتی ہے جب آنکھ کھلتی ہے تو بالین پر مادرِ شفقہ کو پاتی ہے۔ مادرِ شفقہ روتے ہوئے عبدالقادر تاجر کتب کی مادرِ محترمہ کے پاس جاتی ہے اور دونوں آپس میں عاشق و معشوق کی شادی طے کر لیتے ہیں)

ناولسٹ :۔ آیئے ناظرین! چلئے یہ مبارک کام بھی طے پا گیا۔ اب ہم شادی کے روز

پھر ملیں گے۔

جلبسوف :۔ ناولسٹ صاحب! یہ کیا غضب کر دیا آپ نے کہ اتنی جلدی دونوں کی

شادی طے کرادی۔ شادی تو اصولِ ناول کے مطابق "آخری باب" میں

ہونی چاہیئے!

ناولسٹ :۔ میاں! ناولسٹ کی مصلحت تم کیا جانتے ہو؟ جاؤ جاؤ! اپنا کام

کرو اور شادی کے دن ضرور یاد سے آجانا!

جلبسوف :۔ کیا ہمیں بھی شادی کی دعوت ملے گی؟

ناولسٹ :۔ نہیں نہیں، آپ لوگ براتی یا دعوتی نہیں۔ آپ لوگ تو معزز

ناظرین ہیں۔ آپ لوگوں کا کام صرف نظارہ کرنا ہے۔

جلبسوف :۔ افسوس! صد افسوس!

اچھا تو ناولسٹ صاحب!

خدا حافظ!

باب سوم

پیارے ناظرین! دیکھیے شام کا سہانا سہانا وقت ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ وحش وطیور گھنے گھنے درختوں میں بسیرے کے واسطے جمع ہو رہے ہیں۔ کسی کی بزم نو روز سے نقل کی صدا آ رہی ہے۔ کہیں محبوبانِ گل چہرہ پیارے پیارے مکھڑوں پر طلسم پاوڈر مل کر عاشقوں کا دل چھین رہے ہیں۔ بازارِ حسن میں نوجوان چھپے چوری ادھر اُدھر دیکھ کر کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں اور سیڑھیاں چڑھ کر ماہ جبین رنڈیوں کے پہلو میں بیٹھ رہے ہیں اور بیٹھتے ہی چھیڑ چھاڑ شروع کر رہے ہیں اور ادھر بازار میں ایک شاندار برات نکلی ہے۔ وہ دیکھئے۔ وہ شاندار گھوڑے پر ہمارا ہیرو عبدالقادر تاجر کتب کس شان سے اکڑ کر بیٹھا ہے۔ پیچھے پالکیوں کی لمبی قطار ہے۔ ایک سرخ پالکی میں جانِ عبدالقادر یعنی رحمت بی بی دلہن بیٹھی ہے۔ آتشبازیاں چھوڑی جا رہی ہیں۔ روشنی کے ہنڈے ہی ہنڈے ہیں۔ ڈیڑھ دو ہزار آدمی برات کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ مگر گھوڑے کے سامنے باجے والے یہ دھن بجا رہے ہیں:۔

دو دلوں کو یہ دنیا ملنے ہی نہیں دیتی
آشاؤں کی کلیوں کو کھلنے ہی نہیں دیتی

جلیسوف:۔ باجے والے یہ عجیب نغمہ الاپ رہے ہیں۔ دنیا بے چاری نے تو نہ صرف دو دلوں بلکہ دو جسموں کے ملانے کا انتظام کرایا ہے۔ یہ برات اس کا واضح ثبوت ہے۔ پھر یہ گلہ کیوں کہ دو دلوں کو یہ دنیا ملنے ہی نہیں دیتی۔

ناولسٹ:۔ (قدرے غصہ ہو کر) جناب یہ تو نہیں بجا رہا ہوں۔ عجیب آدمی ہیں آپ، آپ سے تو میرا ناک میں دم آگیا۔

دوسرے ناظرین:۔ ارے جانے دیجئے، جانے دیجئے، غصہ تھوک دیجئے۔ اور ہمارے لئے کچھ ارشاد فرمائیے!

ناولسٹ:۔ (غصہ تھوک کر) اب کیا ارشاد و رشاد، اب تو برات دولہا کے گھر پہنچ گئی ہے، دولہا اندر زنان خانے میں جا رہا ہے۔

ناظرین:۔ اب گھر ہی جائیں گے۔ وہاں ہمارا زنان خانے میں کیا کام؟

ناولسٹ:۔ جیسی آپ کی مرضی!

ناظرین:۔ کل ہم پھر ملیں گے؟

ناولسٹ:۔ کل نہیں —— ابھی آپ پورے دو سال تک مجھ سے نہ ملئے۔

ناظرین:- کیوں؟ آپ کو دو سال کی قیدِ بامشقت ہو گئی ہے؟

ناولسٹ:- (محظوظ ہو کر اور ہنس کر) نہیں پیارے ناظرین! اب ہمارا ناول پورے دو سال بعد ہی شروع ہو سکتا ہے۔ کیونکہ کچھ "سخن گسترانہ" بات آپڑی ہے۔

ناظرین:- دو سال!!

(سارے ناظرین زور زور سے رونا شروع کر دیتے ہیں)

ناولسٹ صاحب! بتائیے! ہجر و جدائی کے یہ دو سال کس طرح کاٹے جائیں؟ ناولسٹ صاحب! ہم تو ایک لمحہ کے لئے بھی آپ سے جدا ہونا نہیں چاہتے!

ناولسٹ:- (خود بھی روتے ہوئے) جب آپ لوگوں سے اتنی لمبی جدائی کا خیال مجھے آتا ہے۔ تو کچھ نہ پوچھئے۔ میرے دل پر سانپ لوٹنے لگتا ہے، اگر یہ سرائے فانی ہے۔ صبر کے سوا چارہ نہیں۔ انّ اللّٰہ مع الصّابرین۔ خدا حافظ!

(نالہ و شیون اور آہ و بکا میں بابِ سوم بند ہو جاتا ہے)

باب چہارم

دو سال بعد

ناولسٹ :- آداب عرض ہے پیارے ناظرین! آپ لوگ اچھے تو ہیں؟

ناظرین :- اوہ آپ نازل ہو گئے، خوشی سے ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہم لوگ یہاں صاحب خیریت سے ہیں! اور اب تو آپ آگئے ہیں۔ آگے خیریت کا کچھ پتہ نہیں، ویسے ہم بُری طرح آپ کا انتظار کر رہے تھے۔

ناولسٹ :- اچھا تو پھر آئیے! ہم اس کالی کوٹھی میں چل کر دیکھیں کہ ہمارے ہیرو عبدالقادر کا آخر کیا حال ہے؟ اور ہیروئن رحمت بی بی کی ازدواجی زندگی کس طرح گزر رہی ہے۔

ناظرین :- ہاں ہاں چلئے۔ ہم تو بے حد بیقرار ہیں۔

ناولسٹ :- اچھا تو چلیں جی!

(ناظرین اور ناولسٹ کالی کوٹھی میں پہنچ کر عبدالقادر اور رحمت بی بی کی خواب گاہ میں داخل ہو کر ایک کونے میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں)

ناولسٹ:۔ (سرگوشی میں) پیارے ناظرین! یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟ عبدالقادر اور رحمت بی بی بہت دُبلے نظر آ رہے ہیں۔ دونوں کے چہروں پر اضمحلال اور رنج و غم کی پرچھائیاں ہیں، یہ کیوں؟

جلیسوف:۔ یہ سب آپ ہی کے کرتوت ہیں ناولسٹ صاحب!

ناولسٹ:۔ (غصّے سے) جی!

جلیسوف:۔ جی کچھ نہیں — میں یہ کہہ رہا تھا کہ محبت کی شادیوں کا یہی انجام ہوتا ہے، یعنی .....

ناولسٹ:۔ نہیں کچھ اور سبب ہو گا۔ ٹھہریئے ابھی معلوم کرتے ہیں — اخاہ! یہ کون بزرگ سن رسیدہ، سفید ریش، خضر صورت، فرشتہ صورت کمرے میں آ رہے ہیں۔ اچھا یہ تو عبدالقادر کے چچا مولوی عبدالحق صاحب ہیں۔ جن کی جلد سازی کی مشہور دکان قلعہ گوجر سنگھ کے چوراہے پر ہے۔ یہ بھلا یہاں کس لئے آئے ہیں؟ ناظرین! چپ چاپ دونوں کی باتیں سنیئے!

بزرگ عبدالحق:۔ عزیز من! اگر قبول کرو تو کچھ کہنا چاہتا ہوں!

عبدالقادر:۔ فرمایئے! میں خادم الخدام، آپ مخدوم المخدومان قبول کیوں نہ کروں گا خادم کو بمقابلہ مخدوم مجالِ دم زدن نہیں جو کچھ ارشادِ عالی ہو گا اس کی تعمیل بسر و چشم۔

بزرگ عبدالحق :- میرے پیارے آنکھوں کے تارے میرے عبدالقادر جس طرح بے چراغ گھر تاریک، بے سبزہ و گل باغ ویران ہوتا ہے۔ اسی طرح بے فرزند جگر پیوند حیاتِ والدین تلخ ہوتی ہے۔ فرزندِ دلبند دنیا میں آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہوتا ہے اور عقبےٰ میں باعثِ نجات ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:-

دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر
راحت کوئی آرامِ جگر سے نہیں بہتر
لذّت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر
نکہت کوئی بوئے گلِ تر سے نہیں بہتر

عشرت ہیں جو دولت ہو تو افلاس نہیں ہے
کچھ پاس نہیں گر یہ رقم پاس نہیں ہے

عبدالقادر :- بزرگِ من! آپ نے اور شاعر نے، دونوں نے ٹھیک فرمایا ہے
بزرگ عبدالحق :- تو پھر تم دوسری شادی کیوں نہیں کرتے؟
عبدالقادر :- محترم بزرگ، گستاخی معاف، اگر دوسری شادی کروں گا تو سوکنوں کے جھگڑے سے گھر نمونۂ جہنم بن جائے گا اور پھر کیا عجب ہے کہ میری قسمت میں کوئی پھل ہی نہ ہو۔
بزرگ عبدالحق :- عزیزِ من! تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ تم اگر رعب داب سے کام لو تو کیا مجال ہے کہ سوکنوں میں جھگڑا ہونے پائے، مجھے دیکھو کہ میری چار بیویاں

ہیں مگر کیا مجال کہ آپس میں کسی دن بھی تُو تُو مَیں مَیں ہو جائے۔ رہا دوسرا سوال تو اس کا جواب شاعر نے کیا خوب دیا ہے ؎

اُسے مہر کرتے نہیں لگتی بار   نہ ہو اس سے مایوس امیدوار

عبدالقادر:۔ قبلہ و کعبہ۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ سب جانتے ہیں کہ میری بیوی زندہ ہے اس پر کون اپنی بیٹی دینی گوارا کرے گا؟

بزرگ عبدالحق:۔ یہ بات تمہارے سوچنے کی نہیں۔ میں نے سب انتظام کر لیا ہے۔ میرے پڑوس میں گاؤں کے اسکول کے جو وظیفہ یاب ڈرل ماسٹر ہیں۔ مولوی رسول خاں صاحب ان کی بیٹی زہرہ بی بی چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ مولوی رسول خاں صاحب کو بھی یہ رشتہ منظور ہے۔ اب تم رسول خاں صاحب کو ایک خط آج ہی لکھ دو۔ اب میں دوسرے انتظامات کی تکمیل کے لئے جاتا ہوں۔

(بزرگ عبدالحق چلے جاتے ہیں اور رحمت بی بی اندر سے آتی ہے اور عبدالقادر اس سے پوچھتا ہے)

عبدالقادر:۔ رحمتاں! تم نے چچا صاحب قبلہ کی باتیں سنیں؟

رحمتاں:۔ ہاں سُنی ہیں!

عبدالقادر:۔ تمہاری کیا رائے ہے؟

رحمتاں:۔ کیا حرج ہے۔ آپ خوشی سے دوسری شادی کیجئے۔ کیا عجب کہ کوئی پھل ہاتھ آجائے اور آپ کا نام چل جائے۔

عبدالقادر:۔ اللہ تم کتنی اچھی بی بی ہو، اچھا تو پھر میں فوراً رسول خاں صاحب کو خط لکھتا

ہوں، کہیں معاملہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

(وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتا ہے)

ناولسٹ:۔ پیارے ناظرین! دیکھئے تو عبد القادر کتنا خوش ہے؟

جلیسوف:۔ ناولسٹ صاحب! عبد القادر نے رحمت بی بی سے عشق کیا تھا۔ عشق میں بچوں کی تو شرط نہیں تھی۔

ناولسٹ:۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟ دیکھئے عبد القادر خط لکھ رہا ہے اور اب اس پر بآوازِ بلند نظرِ ثانی کر رہا ہے — ہم بھی تو سنیں؟

خط

منجانب عبد القادر بنام مولوی رسول خاں صاحب وظیفہ یاب ڈرل ماسٹر

بزرگ من زاد لطفہٗ!

تسلیم! پیغام بہ زبانی حضرت چچا صاحب محترم پہنچا!

سر احقر باوجِ عزت افزا شت
بدستِ رحمت از خاک برداشت

میری نہایت خوش نصیبی ہے کہ آپ میرے ساتھ اپنی دختر نیک اختر کا بیاہ رچانا چاہتے ہیں۔ میں آپ کا خادم ہوں۔ ہر طرح رضامند ہوں۔

آپ کا خادم:۔ محمد عبد القادر تاجر کتب

جواب خط

منجانب رسول خاں صاحب بنام محمد عبد القادر تاجر کتب

عزیزم! طول عمرہ!

آداب و نیاز! اتحاد نامہ مشعرِ رضامندیٔ شادی صادر ہوا۔ معزز و ممتاز فرمایا۔ دریافتِ قاضیٔ شہر ساعتِ شادی سترہ شعبان المعظم سالِ حال قرار پائی ہے

گر قبول افتد زہے عز و شرف

تمہارا خیر طلب

رسول خاں عفی عنہ

ناولسٹ:۔ پیارے ناظرین! چار پانچ یوم پہلے میں آپ کو بہت ڈھونڈ رہا تھا

ناظرین:۔ کیوں بھلا۔

ناولسٹ:۔ ارے بھئی اپنے عبدالقادر کی دوسری شادی کی تقریب تھی۔ خیر شادی ہو گئی، مگر ساتھ ہی ساتھ خانہ بربادی کا بھی آغاز ہو گیا!

ناظرین:۔ کیوں؟ رحمت بی بی نے تو خوشی سے اجازت دے دی تھی۔

ناولسٹ :- ارے صاحب! وہ بھی تو عورت ہے۔ شادی کے دوسرے دن
دونوں سوکنوں میں خوب جوتی بیزار شروع ہوگئی، اور یہ ہمارا ہیرو عبدالقادر
کہاں رحمت بی بی کے عشق میں گرفتار تھا۔ کہاں یہ عالم کہ اب رحمت بی بی
کی صورت تک دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔

جلیسوف :- ناولسٹ صاحب! ذرا چُپ رہئیے، وُہ دیکھئے کالی کوٹھی سے رونے
چیخنے کی آوازیں آرہی ہیں۔

ناولسٹ :- ارے ہاں بھئی! — چلو ذرا دیکھیں تو سہی کیا ماجرا ہے؟

(ناولسٹ اور ناظرین کالی کوٹھی میں پہنچ جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں
کہ رحمت بی بی اور زہرہ بائی (نئی بیوی) میں جوتی بیزار ہورہی ہے
ایک کے بال دوسری کے ہاتھ میں، دوسری کا چونڈا پہلی کے ہاتھ
میں، اتنے میں عبدالقادر باہر سے آتا ہے اور اندر آکر آپے سے باہر
ہوجاتا ہے اور پاؤں سے جوتا نکال کر دونوں کو الگ کرتا ہے۔
اور پھر پرانی بیوی رحمت بی بی کو اتنا مارتا ہے کہ وہ بیہوش ہوجاتی
ہے اور کئی گھنٹے بیہوش پڑی رہتی ہے۔ بی ہمسائی یہ ماجرا دیکھ کر
رحمت بی بی کے بھائی رجو پہلوان (جو گاؤں کا مشہور پہلوان ہے)
کے گھر جاتی ہیں اور سب نقطہ سناتی ہیں۔ رحمت بی بی کا بھائی رجو پہلوان
غصے سے ڈنڈ بیٹھک نکال کر، دودھ پی کر، مگدر لے کر، عبدالقادر کے

گھر جاتا ہے لیکن عبدالقادر کی خوش قسمتی سے عبدالقادر موجود نہیں ہوتا اس لئے وہ اپنی بہن کو ڈولی میں بٹھا کر گھر لے جاتا ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد رحمت بی بی سارا قصہ اپنے پہلوان بھائی کو سناتی ہے تو پہلوان کو دوبارہ غصہ آتا ہے اور وہ پولیس میں رپورٹ کرتا ہے۔ رحمت بی بی کے جسم پر چوٹ کے نشان دکھا کر، مار پیٹ اور زیور اتار لینے کا دعوے کرتا ہے)

باب ششم

ناولسٹ: پیارے ناظرین! آیئے آج ذرا عدالت تک چلیں گے۔ وہاں آج عبدالقادر اور رحمت بی بی کا مقدمہ پیش ہونے والا ہے۔

جلیسوف: چلئے جی! اکالی کوٹھی سے عدالت آگئی۔ اب نہیں معلوم ہم کو کہاں کہاں کی خاک چھنوائیں گے۔ آج عدالت تو کل جیل خانہ۔ پرسوں جہنم۔

(ناولسٹ شعلہ بار نظروں سے جلیسوف کو دیکھتا ہے اور جلیسوف سہم کر چپ ہو جاتا ہے)

عدالت

پیشکار:۔ چپڑاسی! سماۃ رحمت بی بی کو آواز دو؟

چپراسی :- مسماۃ رحمت بی بی حاضر ہے ؟

رحمت بی بی :- جی ہاں۔ حاضر ہے۔

مجسٹریٹ :- تم اپنا بیان لکھاؤ۔

رحمت بی بی :- حضور میرے شوہر عبدالقادر نے میری سوکن زہرو بی بی کے کہنے میں آکر مجھے زدوکوب کیا اور میرا زیور قیمتی دو صد روپیہ چھین کر مجھے گھر سے نکال دیا۔

پیشکار :- پہلوان گواہ کو حاضر کرو۔

پہلوان :- جی حضور، حاضر!

مجسٹریٹ :- تم مستغیثہ کے بارے میں کیا جانتا ہے؟

پہلوان :- حضور مستغیثہ میری سگی بہن ہے۔ اس کے پاس دو صد روپیہ کا زیور تھا جس کو میرے بہنوئی عبدالقادر نے مار کر چھین لیا اور گھر سے نکال دیا۔

مجسٹریٹ :- ملزم عبدالقادر کو حاضر کرو۔

عبدالقادر :- جی حضور! میں حاضر ہوں۔

مجسٹریٹ :- جس وکت مسٹغیثہ تمہارے پاس تھا۔ اس کے پاس ڈو سو روپے کا زیور تھا کہ نہیں تھا۔

عبدالقادر :- تھا مگر میں نے اس میں ایک زیور بھی نہیں لیا۔ وہ سب اپنے میکے لے گئی ہے

مجسٹریٹ :- تم نے مسٹغیثہ کو مارا؟

عبدالقادر :- حضور! وہ میری بیوی ہے۔ یہاں بیوی کو مارنے کا عام رواج ہے۔

اوجو مرد اپنی بیوی کو نہیں مارتا۔ اس کو لوگ مرد نہیں سمجھتے۔

مجسٹریٹ :- تُم جنگلی آدمی ہے۔ ہمارے لنڈن میں کوئی بی آدمی اپنا لیڈی لوگ کو نہیں مارتا۔ تُم مارتا۔ تُم بڈماس آدمی ہے۔ تُم بے کونٹ ہے۔ اچھا۔ اب جاؤ۔ بعد چار یوم کے ہم حکم سنائے گا۔

بابِ ہفتم

ناولسٹ :- پیارے ناظرین! یہ دیکھو، تمہارے سامنے کون آرہا ہے۔ کوئی جان پہچان کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اخاہ! یہ تو وہی ہمارا ہیرو عبدالقادر ہے۔ بیچارہ بڑا پریشان نظر آرہا ہے۔ ہائے ہائے۔ اس کی کیا حالت ہو گئی۔ مگر یہ اتنے تیز تیز ڈگ بھرتا کہاں جارہا ہے ـــــ؟ ارے یہ تو رحمت بی بی کے گھر میں گھُس گیا ہے۔ آئیے ناظرین ہم بھی گھُسیں۔

رحمت بی بی :- کون تم کہاں آگئے یہاں ؟ جاؤ عدالت کے فیصلے کا انتظار کرو عبدالقادر۔ (دھم سے رحمت بی بی کے پیروں پر گر پڑتا ہے) خدا کے لئے مجھے اب عدالت و دالت میں نہ گھسیٹو۔ تم نے خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ میں

عہد کرتا ہوں کہ آئندہ میری اور میری دوسری بیوی کی وجہ سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ چلو میرے گھر چلو، یہیں راضی نامہ کرلیں گے، یہ عدالت کا بکھیڑا ختم کرو۔ بہت رسوائی ہو چکی!

پہلوان :- اچھا تو قرآن مجید اٹھا کر قسم کھا کہ آئندہ پھر دغا نہ کروں گا اور میری بہن کی محبت میں ثابت قدم رہے گا۔

عبدالقادر :- مجھے منظور ہے، اب راضی نامہ کرا دو۔ تاکہ کل قبل صدور حکم راضی نامہ عدالت میں داخل ہو۔

پہلوان :- اچھا!

ادخال راضی نامہ

مسماۃ رحمت بی بی مستغیثہ — بنام عبدالقادر ملزم

غریب پرورا سلامت!

جناب عالی! مقدمہ مندرجہ عنوان میں مجھ و رحمت بی بی مستغیثہ اور عبدالقادر ملزم کے درمیان راضی نامہ ہو گیا ہے۔ اب ملزم پر کسی بات کا دعوے نہیں ہے۔ چاہتی ہوں کہ مقدمہ مندرجہ بالا بلا تجویز خارج کر دیا جائے۔

العبد	العبد
مسماۃ رحمت بی بی مستغیثہ	عبدالقادر ملزم

پیش ہو کر حکم ہوا کہ :۔

مقدمہ حسب استدعا مستغیثہ بلا تجویز نمبر ..... سے خارج ہو کر مثل داخلِ دفتر ہوا۔

شرح دستخط مجسٹریٹ بہادر

پیارے ناظرین :۔ ادھر عبدالقادر، رحمت بی بی کو لے کر گھر میں داخل ہوا۔ کہ اس کی دوسری بیوی زہرہ بی بی غصہ میں آ کر اپنے میکے چلی گئی ہے۔ عبدالقادر نے اُسے سمجھانے منانے کے لئے خط لکھا:۔

خط

منجانب عبدالقادر بنام زہرہ بی بی

محرم راز و ہمدم ہمساز دام عصمتہا

بعد اشتیاقِ مواصلتِ جسمانی و مکالماتِ ہمزبانی واضح ہو کہ تم بے کار غصہ میں آ کر چلی گئی ہو۔ میں دراصل عدالت اور جیل خانہ سے ڈرتا تھا۔ اس لئے میں نے رحمت بی بی سے معافی چاہ لی ہے۔ اسے گھر لایا ہوں۔ تم ذرا سمجھداری سے کام لو، فوراً آجاؤ اور میرے دل و جسم کو شاداب کرو۔

تمہارا صادق شوہر

عبدالقادر

اس خط کا جواب آیا کہ میں تمہاری صورت تک نہیں دیکھنا چاہتی۔ عبدالقادر

بیچارہ بڑا پریشان ہوا۔ اسی اثنا میں اندر کے کمرے سے رحمت بی بی آئی اور بولی کہ میرا زیور، میرے کپڑے اور میرا سب سامان تمہاری چہیتی لاڈلی بیوی لے کر چمپت ہو گئی ہے۔ میرا زیور وغیرہ منگوا دو، ورنہ میں ابھی اپنے پہلوان بھائی کو بلاتی ہوں۔

بیچارا عبدالقادر عجیب مصیبت میں مبتلا گھر سے باہر نکلا اور ایک کنوئیں کے کنارے جا کر بیٹھ گیا۔ چونکہ سردی ہو رہی تھی۔ اس لئے اس نے ایک چرٹ سلگا کر پیا۔ اسی اثنا میں سورج غروب ہو گیا۔ تو وہ رحمت بی بی اور زہرہ بی بی دونوں کو ماں بہن کی گالیاں دیتا ہوا کنوئیں میں کود گیا اور اپنی جان جانِ آفرین، سپردِ خلد بریں کر دی۔

باب آخری

ناولسٹ:۔ پیارے ناظرین! ہمارا ناول اب ختم ہوا۔ اب آپ کو صرف نتیجہ سے آگاہ کرتے ہیں کہ عبدالقادر تاجر کتب کو دو شادیاں کرنے سے کیسی کیسی تکالیف اٹھانی پڑیں۔ کیسے حوادثاتِ عظیم کا مقابلہ کرنا پڑا۔ بیچارے کو اپنی جان دے دینی پڑی۔ ہائے کیا غمناک ناول ہے۔

جلبسوف :- کیا غمناک ہ ۔۔۔ بالکل فضول ناول ہے۔

دوسرے ناظرین :- ہاں ہاں بالکل فضول ناول ہے۔ یہ ناولسٹ "ادب برائے ادب" کا قائل ہے۔ یہ آج سے دو سو برس پہلے کا ناول نگار معلوم ہوتا ہے خواہ مخواہ ہمارا وقت اور ہمارے ڈھائی روپے خراب ہوئے۔ وقت تو واپس نہیں آسکتا۔ ہمارے روپے بھی واپس نہیں ہو سکتے۔ چلو دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے اسے پکڑ کر خوب پیٹو۔

(ناولسٹ یہ دھمکی سن کر ادب سے بھاگنا چاہتا ہے اور ناظرین پکڑو پکڑو ۔۔۔ ادبی ڈاکو ۔۔۔ ادبی ڈاکو ۔۔۔ ادبی ڈاکو ۔۔۔ ادبی چور ۔۔۔ پکڑو اسے ۔۔۔ اور ایک چور اہے پر پکڑ کر سب ناظرین مل کر ناولسٹ سے گتھم گتھا ہو کر خوب مارتے پیٹتے ہیں۔ ناولسٹ رونے لگتا ہے۔ تو جلبسوف کہتا ہے)

جلبسوف :- تنقید نگار تو تمہیں معاف کر سکتے ہیں، مگر اب قارئین کرام تمہیں معاف نہیں کریں گے۔ کان پکڑو، اور نئے اصول "ادب برائے زندگی" پر عمل کرو۔

(ناولسٹ روتا ہوا ریلوے اسٹیشن کی طرف چلا جاتا ہے)

لپ اسٹک، ٹوتھ پیسٹ، انگوٹھی، جوتے وغیرہ

(ڈرائنگ روم گوسپ)

مجھے اشتہارات پڑھنے کا بڑا شوق ہے جب کوئی تازہ اخبار یا رسالہ خریدتا ہوں تو پہلے اس کے اشتہارات پڑھتا ہوں اور بعد میں خبریں اور مضامین ـــــ آپ یہ سن کر فوراً دریائے حیرت میں ڈوب جائیں گے بلکہ جب آپ کا دریائے حیرت پایاب ہو جائیگا تو آپ بھیگے بھیگے متعجب لہجے میں مجھ سے پوچھیں گے کہ بھئی عجیب اُلٹے آدمی ہو۔ ایسا اُلٹا کیوں چلتے ہو؟ تو اس کا سیدھا جواب میرے پاس یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ سماج میں تجارتی اشتہارات کو جتنی اہمیت حاصل ہے اتنی نہ جارج برنرڈشا کے ڈراموں کو حاصل ہے اور نہ نیویارک ٹائمز کی خبروں کو ـــــ دنیا کی تین چوتھائی سے زیادہ آبادی جی۔ بی۔ شا کے ڈراموں سے زیادہ ہنری فورڈ کی موٹر کاروں سے واقف ہے۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ سماج میں کتاب موٹر کار کے مقابلے میں بڑی ہیچ اور حقیر تصور کی جاتی ہے ـــــ آپ کسی بازار میں چلے جایئے ہاورڈ فاسٹ کا ناول آپ کو دس بارہ روپے میں مل جائیگا اور فورڈ کی موٹر کار دس

حالانکہ کتاب اِنسان کو بناتی ہے اور ڈور کا اِنسان کو زندتی ہے۔ بارہ ہزار روپے میں

بات دراصل یہ ہے کہ بورژوا سماج میں سیم و زر نے آرٹ اور مشین نے اِنسانیت کو بری طرح کچل کر رکھ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ڈالر زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور اِنسان زیادہ مرتے ہیں۔ زمین کی سطح پہ جتنے بنک زیادہ ابھرتے جا رہے ہیں۔ اتنی ہی زیادہ قبریں زمین میں دھنستی جا رہی ہیں۔

اس تمہید کی روشنی میں یہ نتیجہ بآسانی نکالا جا سکتا ہے۔ کہ سرمایہ دارانہ سماج میں زندگی — زندگی برائے تجارت ہے۔ اِنسان ایک تاجر کی طرح چند برسوں کے لئے اس دنیا میں آتا ہے۔ اس ہاتھ دیتا ہے۔ اس ہاتھ لیتا ہے۔ اور پھر لٹے لٹا کر اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ گویا دنیا اِنسان کا گھر نہیں ہے۔ اِنسان کا بازار ہے۔ بڑے بڑے لطف کی بات ہے کہ اس بازار میں تجارت بھی تو اتنی نہیں ہوتی جتنی اشتہار بازی ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بورژوا زندگی اشتہار کا دوسرا نام ہے۔ جس طرح اس سماج میں انسانیت چاندی کے سکوں تلے دبی ہوئی ہے۔ اسی طرح سرمایہ دارانہ تجارت بھی اشتہار کی اوٹ میں چھپی ہوئی ہے۔ اگر ہم کسی سکول بوائے کی طرح یہاں خلاصہ لکھنے بیٹھ جائیں تو یوں لکھیں گے۔

"پس ثابت ہوا کہ سرمایہ دارانہ سماج تجارت ہے اور تجارت محض اشتہار ہے"

اس خلاصے کی تفصیل یہ ہوگی کہ سرمایہ دارانہ تجارت کا وجود محض اشتہار کے وجود سے قائم ہے۔ اگر سرمایہ دارانہ تجارت کے جسم سے اشتہارات نوچ لئے جائیں، تو چہرہ بالکل

ننگی ——— ننگی بھی ایسی ننگی جیسے "ایسوپس فیبلز" کا وہ کوا جو اپنے پروں میں ہنس کے پر لگا کر راج ہنس بن گیا تھا۔ اور جب اس کے پر نوچ لیے گئے تو وہ کوا ——— بالکل کوا ہو کے رہ گیا۔
اس تلمیح کے ضمن میں اگر میں سرمایہ دارانہ سماج کو وہ کوا کہوں جو تجارتی اشتہارات کے پر لگا کر راج ہنس بنا ہوا ہے تو اس میں برا ماننے کی کونسی بات ہے ——— ؟ بلکہ آپ تو تعریف آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے فرمایئے کہ واہ بھئی واہ ——— تم تو بڑے ذہین ہو بڑے کمال کی تشبیہیں دیتے ہو۔

اس ذرہ نوازی پر آپ کو مجبور کرتے ہوئے میں یہ عرض کروں گا کہ آپ میری ذہانت کے مداح ہوں یا نہ ہوں میں تو کم از کم سرمایہ دارانہ تجارت کی اشتہار بازی کے کمال کا بڑا معترف اور بڑا مداح ہوں ——— سرمایہ دارانہ سماج اندر سے جتنا کھوکھلا نظر آتا ہے اس کی روح یعنی تجارت کا بھی یہی حال ہے۔ یہ بھی اندر سے بالکل کھوکھلی ہے۔ مگر اوپر سے رنگ برنگے اشتہارات میں بٹتی ہوئی نظروں کو فریب دے رہی ہے۔ اس کو دیکھ کر آپ بالکل یہی محسوس کریں گے۔ جیسے سینٹ میری گرلز ہائی سکول کے فینسی ڈریس مینا بازار میں آپ نے آٹھ آنے کا ایک رنگین بنڈل خریدا اس کی خوبصورت پیکنگ کا ایک ایک رنگین کاغذ الگ کیا اور اندر سے پنسل کا صرف ایک ٹن آپ کے ہاتھ لگا ——— یہاں برسبیل تذکرہ میں اس عبرت انگیز حقیقت کی طرف اشارہ کر ہی دوں کہ اے صاحبو! یہ سرمایہ داروں کی دنیا بھی گویا فینسی ڈریس مینا بازار ہے۔ جہاں زندگی ایک خوبصورت پیکنگ کیا ہوا بنڈل ہے جس کے اندر کچھ نہیں ہے اور اگر کچھ ہے تو وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

ماڈرن تجارت کے اشتہارات کو پڑھ پڑھ کر ہم بہ آسانی دھوکہ کھاتے ہیں کہ انسان نے سرمایہ داری کے دور میں کتنی حیرت انگیز ترقی کر لی ہے۔ وی ٹیکس آپ کو گنجا ہونے سے بچاتا ہے۔ ہارلکس آپ کو سدا بہار جوانی عطا کرتا ہے۔ وکس کی گولیاں آپ کی کھانسی کو جڑ پیڑ سے اکھیڑ پھینکتی ہیں۔ یارڈلیز کے کریم آپ کے چہرے پر جھریوں اور بڑھاپے کو آنے نہیں دیتے۔ پنسلین کے انجکشن آپ کو کبھی مرنے نہیں دیتے۔

مگر ان اشتہارات کے پیچھے جھانک کر آپ انسانیت کو دیکھئے تو وہ گنجی، لنگڑی لولی، کھانستی، ہنگتی، سسکتی دم توڑ رہی ہے ——— اور اشتہار کے اس طرف حیوانیت انسانیت کا مصنوعی زرق برق لباس پہنے سرمایہ داروں کے اس فینسی ڈریس میلیا بازار میں زندگی کا رنگین بنڈل ہاتھ میں لئے کھڑی ہے جو اندر سے بالکل خالی ہے۔

. . . . چلئے میں آپ کی یہ بات تسلیم کر لیتا ہوں کہ اشتہار بازی تجارت کی ترقی کے لئے بہت ضروری ہے۔ مگر آپ کو جواباً میری یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ موجودہ تجارت کی طرح موجودہ اشتہار بازی بھی آپ کو صرف اسپلائٹ کرتی ہے اور محض اکسپلائٹیشن اس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ مثلاً ابھی ابھی میں نے ——— آن لکر میگزین میں کالگیٹ ڈینٹل کریم کا ایک اشتہار پڑھا تھا جو یہ تھا۔

"بے چاری مارگریٹ لاک وڈ!

لوگ اس کے دانتوں کی بدبو کے باعث اس سے دور بھاگتے تھے۔ مگر اس نے ایک ڈاکٹر کے مشورے سے کالگیٹ ربن ڈینٹل کریم استعمال کرنا شروع کر دیا جس کے باعث

گرج اس کے اطراف اس کے دوستوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔

بیچئے ——— بورژوا سماج میں ڈینٹیل کریم دانت صاف کرنے کیلئے نہیں بلکہ اپنے گرد دوستوں کے جمگھٹے جمع کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ پونڈز کریم اور وانشنگ ان ہیرس سنٹ چہرے کی چمک اور کپڑوں کی خوشبو کے لئے نہیں بلکہ لڑکیوں کو پھانسنے کے کام آتی ہیں ——— "آفی سلما کریم" لڑکیوں کو ایک چمکیلا چہرہ نہیں بلکہ ایک —— (Kiss Attractingf.. عطا کرتی ہے۔ پیرس نرا کسپیرنٹ گلیسرین سوپ اور کٹی کیوڑا کے صابن آپ کا منہ نہیں دھلاتے ہیں بلکہ آپ کو اسٹیمر ڈیمیز باز بننے میں مدد دیتے ہیں۔ اوکاساکی مقوی گولیاں آپ کو جنسی تعلقات کی فطری نوعیت بتانے کے بجائے جی بھر کر عیاشی کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ کیونکہ اوکاسا کمپنی کا دعویٰ ہے کہ آپ ساٹھ برس میں بھی چار شادیاں کر سکتے ہیں ——— کوٹیکس کے سینٹری نیپکن استعمال کیجئے ورنہ ڈانس فلور پر آپ کا ڈانس پارٹنر آپ کو اکیلا چھوڑ دیگا۔ میکس فیکٹر لپ اسٹک لیبارٹریز کا اشتہار ہے کہ ہمارا لپ اسٹک لگائیے پھر اپنے محبوب کو ایک ہزار بوسے دیجئے۔ مگر ہونٹوں پر ذرا سا نشان، کوئی TELLTALE یا ایک بھی فسانوی نظر نہ آئے گا۔ گویا لپ اسٹک ہونٹوں کو رنگین اور خوبصورت بنانے کیلئے نہیں بلکہ چور محبت کے ہزاروں بوسوں کو چھپانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے کیوٹیکس کا نیل پالش استعمال کیجئے۔ ورنہ کوئی مرد آپ کی انگلیوں میں شادی کی انگوٹھی نہیں پہنائے گا۔ مسٹر جو بو تو مو یہ ڈیرائٹر، ولو مو مبہم کہ دس آن لیسٹ کیجر پرادڈے

نیویارک امریکی لڑکیوں کو متنبہ کرتا ہے۔

Beautify your Bust

Because all the gay boys of broadway club are after those girls who have appealing plumpy. developed thrilling curved alluring, and pointed bust.

یعنی اپنا سینہ اپنے جسمانی حسن کے لئے نہیں بلکہ براڈوے کلب کے چند شوقین نوجوانوں کے لئے خوبصورت بنایئے۔

اِن اشتہارات کا بغور مطالعہ کیجیئے تو آپ اپنی ذہنی استطاعت کے مطابق جلد یا بدیر اس نتیجے پر ضرور پہنچیں گے کہ دورِ سرمایہ داری کی تجارت نے اِنسان کو زندگی کو فطری تقاضوں کے بجائے مصنوعی مقاصد کی راہ پر ڈال دیا ہے، جس کا یہ اثر ہوا ہے کہ زندگی بھی مصنوعی ہو کر رہ گئی ہے۔ اِنسان گویا فطرت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر رہا بلکہ بال فیلڈ وں ٹریڈ کمپنیوں، فیکٹریوں اور بنکوں کے لئے زندگی بسر کر رہا ہے۔ جیسے وہ دنیا میں رہنے بسنے کے لئے نہیں آیا۔ بلکہ ڈالر جمع کرنے کے لئے ٹہلتا ٹہلتا دنیا کی سطح پر کچھ دیر کے لئے آگیا ہے۔ جیسے زندگی میں اور کوئی جد و جہد نہیں، اور کوئی اسٹرگل نہیں سوائے اس کے کہ اپنے گرد دوستوں اور چاہنے والوں کا جمگھٹا جمع کیا جائے یا جیسے زندگی اسٹڈی بیکر خریدنے کے بعد شروع ہوتی ہے اور اپنی محبوبہ کی انگلی میں شادی کی انگوٹھی پہنا دینے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اور اپنی محبوبہ کی انگلی میں شادی کی انگوٹھی پہنا

دینے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ یا پھر وہی آدمی ——— انسان ہے جس کی تجوری سکوں سے بھری ہے۔ جس کے جیب میں چیک بک ہے جس کے گراج میں رولز رائس کھڑی ہے۔ جس کے وارڈ روب میں جیک ویسر من اینڈ کو کے لباس بھرے ہیں۔ جس کے سگریٹ کیس میں بلیک اینڈ وائٹ کے سگریٹ ہیں، جس کی بوتلوں میں شمپین اور ماؤتھ بھری ہوتی ہے، جس کے ڈریسنگ ٹیبل پر ویسٹ ہو کمپنی کا میک اپ کا سارا سامان رکھا ہوا ہے، جس کے بیڈ روم میں روزانہ ایک نئی نویلی لڑکی ایک رات کے لئے انگوٹھی پہنتی ہے، جس کے گودام میں آسٹریلین گیہوں اور ہندوستانی چاول کے تھیلے بھرے ہوئے ہیں، جس کے سرونٹ کوارٹر میں نیگرو اور ہندوستانی غلام ہیں۔

سرمایہ داروں کے اس بازار میں پہنچ کر انسان زندگی کی اصلی منزل سے بالکل ہی بھٹک جاتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ داروں نے انسان اور اس کی اصلی منزل کے درمیان بہت سی مصنوعی منزلیں کھڑی کر دی ہیں جس سے وہ سمجھتا ہے کہ میں گھر سے نکل کر سیکریٹریٹ پہنچ گیا تو منزل تک پہنچ گیا۔ اسے امپیریل بینک تک جانا ہے۔ امپیریل بینک منزل ہے اس نے صاحب کے جوتے پالش کر دیئے، زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔ یہ بیچ بازار میں پہنچ کر اس نے اپنے آپ کو ایک دھوکہ دیا اور زندگی ختم ہو گئی۔

دھوکہ ——— سرمایہ دارانہ تجارت محض دھوکہ ہے اور اس کا اشتہار اشتہار نہیں دھوکے کی ٹٹی ہے ——— انسان کو بیوقوف بنانا پورے سماج کا واحد نصب العین ہے

اب اس اجمال کی تفصیل میں ایک واقعہ سنیئے۔ سنہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ نئی دہلی

کے رلائے سینا پارک میں ایک امریکن لیڈی نے ایک ہوٹل قائم کیا جس کا نام "رین بو" ہوٹل تھا۔ وہ ہوٹل کچھ چلتا نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دہلی نئی دہلی بن جانے کے باوجود آخر ہندوستانیوں کی بستی تھی جو رین بو سے باتیں کرنے والے سکائی سکریپر میں نہیں رہتے۔ بلکہ زمین پر رہتے لیتے ہیں۔ ان کی رین بو تک کہاں پہنچ ---! ایک دن وہ امریکن لیڈی مکھیاں مارتے مارتے تنگ آگئی اور ایک برٹش اڈورٹائزمنٹ فرم میں گئی اور اپنے ہوٹل کی ویرانی کے بارے میں صلاح مشورہ کیا۔ اس اڈورٹائزمنٹ فرم نے وعدہ کیا کہ وہ ایک دن میں اس ہوٹل کو نئی دہلی تو کیا ساری دنیا میں مشہور کر دے گا امریکن لیڈی نے اس سے کانٹریکٹ کر لیا۔ دوسرے دن برٹش اڈورٹائزمنٹ فرم نے اس ہوٹل کے پرانے سائن بورڈ کی جگہ نیا سائن بورڈ لگا دیا "آٹھ دروازہ ہوٹل" حالانکہ اس ہوٹل کے صرف تین دروازے تھے --- اب جو آدمی ادھر سے گزرتا بڑے حیرت ناک لہجے میں اپنے ساتھی سے کہتا،

"ارے دیکھو تو --- کس پاگل نے یہ ہوٹل قائم کیا ہے۔ نام رکھا ہے "آٹھ دروازہ ہوٹل" اور دروازے ہیں صرف تین۔ آؤ۔ اندر چل کر ذرا اس پاگل کو تو دیکھیں!

مگر اندر جا کر جب وہ اس امریکن لیڈی کے تابناک حسن اور میٹھی مسکراہٹ کو دیکھتے تو خود پاگل ہو جاتے۔ پھر باہر آکر ہر ایک کو پاگل ہونے کا مشورہ دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ دن کے اندر اندر وہ ہوٹل نئی دہلی تو کیا سارے شمالی ہندوستان میں مشہور ہو گیا۔ دہلی اور علی گڑھ یونیورسٹی کے سینکڑوں طالب علم پاگل ہوئے تھے۔ جن پر

آپ کے اِس خاکسار کو بھی پاگل پن کا یہ شرف حاصل ہو چکا ہے۔ ہم چند سٹوڈنٹ ہر جمعہ کی چھٹی میں کافی روپیہ لے کر آٹھ دروازے والی لیڈی کے سامنے اپنی امارت کا خوب خوب مظاہرہ کرتے۔ مگر یہ دوسری بات ہے کہ اس ہوٹل کا کوئی نواں دروازہ نہیں تھا۔

اب ایک اور مزیدار واقع بھی لگے کانوں سُن لیجئے۔ مجھے ایک زمانے میں "ریڈرز ڈائجسٹ میگزین" پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک بار میں نے اس کے ایک کرسمس نمبر میں امریکہ کے مشہور افسانہ نگار جارج لائن کی ایک کہانی پڑھی جو بڑی دلچسپ تھی اور ادھوری تھی۔ افسانہ نگار نے کہانی کو یوں ادھورا چھوڑا تھا:

"اگر آپ میری کہانی کی ہیروئن کے بارے میں مزید کچھ جاننا چاہتے ہیں تو فلاں ناول نویس کا فلاں ناول جو فلاں پبلشر نے شائع کیا ہے ضرور پڑھیے۔"

میں نے بڑی بے تابی سے فوراً فلاں پبلشر کو ایک خط لکھ کر فلاں ناول نویس کا فلاں ناول منگوا لیا۔ مگر وہ ناول اتنا واہیات تھا کہ میں نے غصہ میں آ کر ایڈیٹر ریڈرز ڈائجسٹ کی معرفت افسانہ نگار جارج لائن کو لکھ دیا کہ تم نے اپنی بہترین اور ادھوری کہانی کے ذریعے جس ناول کو پڑھنے پر مجبور کیا تھا وہ بالکل بکواس ہے تم نے ایسی بددیانتی کیوں کی۔ بواپسی ڈاک جلد جواب دو۔

میرے اِس خط کا جواب شکاگو سے یوں آیا:

مائی ڈیر ابراہیم جلیس :

تمہارا شکوہ بجا ہے۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ اس ناول کا پبلشر میرے پاس آیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اس نے اس ناول کو ساٹھ ہزار کی تعداد میں شائع کیا ہے اور چھ مہینے گزرنے پر بھی ایک کاپی فروخت نہیں ہوئی۔ اگر آپ اس کی اشاعت کی کوئی ترکیب مجھے بتائیں تو میں آپ کو دس ہزار ڈالر معاوضہ دے سکتا ہوں۔ مجھے میری کی بیچگی کے لئے روپوں کی شدید ضرورت تھی۔ اس لئے میں نے ایک اشتہاری کہانی لکھی اور اس کو ادھورا اس لئے چھوڑا کہ میرے قارئین کرام بھی اس ناول کو پڑھیں۔ چنانچہ پبلشر نے مجھے بتایا ہے کہ میری کہانی کی بدولت ایک مہینے کے اندر اندر اس پہلے ایڈیشن کی ساٹھ ہزار جلدیں ساری کی ساری فروخت ہوگئیں۔

یہ ادبی بددیانتی تو ہے۔ مگر میرے دوست مجھے داد دو کہ میں نے تشہیر کے اس عجیب وغریب طریقے کو پیش کر کے امریکہ اور انگلستان کی بڑی بڑی اڈورٹائزنگ ایجنسیوں کو بھونچکا کر دیا ہے۔

جواب کا منتظر

تمہارا جارج لائن

خط پڑھ کر میں بھی بھونچکا رہ گیا۔ جب بڑی دیر بعد میرا بھونچکا پن ختم ہوا تو میں نے نہ صرف وہ واہیات ناول بلکہ جارج لائن کی بھی ساری کتابیں بک شلف سے نکال کر کھڑکی سے باہر سڑک پر پھینک دیں۔ ادبی دیانت یا بددیانتی کو تو الگ رکھئے

ذرا موجودہ تجارت کی اس دھوکہ بازی کو دیکھئے۔ چیل اڑتی ہے تو شور مچاتے ہیں کہ بھینس

اڑ رہی ہے اور بھینس ڈکرا رہی ہو تو اعلان کرتے ہیں کہ کارمن مراندا گا رہی ہے

آپ یہاں مجھ سے ایک سوال ضرور پوچھیں گے کہ میں اپنے وطن کو چھوڑ کر انگلستان

اور امریکہ کی اشتہار بازی کی دھجیاں کیوں اڑا رہا ہوں۔ حالانکہ اپنے وطن بلکہ پورے

پورے برِ عظیم میں تو اشتہار بازی بڑی ہی زبون حال ہے۔ یہ سوال یقیناً پوچھا جانا چاہیے

تھا۔ مگر چلیے بعض اوقات سوالات کے پوچھے جانے کے بغیر ہی جوابات دینے پڑتے

ہیں۔ یہ بھی آخر بورژوائی سماج کا ایک اخلاق ہے۔ اس لئے جواب یہ ہے کہ پہلے انگلستان

امریکہ کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ وہ دونوں ہمارے مائی باپ ہیں، ہمارے آقا ہیں

ہم تو ان کے غلام ہیں۔ اور مجھے حقِ نمک حلالی ادا کرنا تھا۔ اور سچ پوچھئے تو اپنے

وطن کی اشتہار بازی کا ذکر علیحدہ کرنا ضروری ہے۔ یا حسب کہ دونوں ملک ہندوستان

اور پاکستان خود بھی انگلستان اور امریکہ کے بازاروں کی دوشاخیں ہیں۔ اسی تو رنگا کمو ڈشن

سالٹ انگریز اور امریکن بھی کھاتے ہیں اور ہندوستانی اور پاکستانی بھی کھاتے ہیں۔

تاکہ وقتِ ضرورت یہ نمک پھوٹ پھوٹ کر نکلے —— ڈبلیو۔ ڈی اینڈ ایچ۔ او۔

دلس کی سگرٹیں لندن اور نیو یارک کے علاوہ دہلی اور کراچی میں بھی پی جاتی ہیں سیون

اوکلاک بلیڈز سے آرتھر مرے اور جارج السبرگ بھی شیو کرتے ہیں۔ اور قمر الدین

رام لال بھی —— چونکہ غلامی کی برکات نے انارکلی اور چاندنی چوک کے بازاروں

کو وال سٹریٹ اور بانڈ سٹریٹ کے ساتھ مضبوطی سے جوڑ دیا ہے۔ اس لئے بورژوائی

تجارت کی مخصوص اشتہار بازی پاکستان اور ہندوستان پر بھی چھائی ہوئی ہے
البتہ یہ صحیح ہے کہ دھوکہ دہی، جھوٹ اور مبالغہ آرائی میں ہم اپنے آقاؤں سے
ایک دو ہاتھ ذرا اونچے ہی ہیں۔ اس کا ایک تازہ ثبوت دینے کے لئے میں یہیں
تیار ہوں۔ ہوا یہ تھا کہ کچھ دن پہلے لاہور میں ایک ہندوستانی فلم دکھائی جا رہی
تھی جس کا اشتہار اخبار میں یوں چھپا تھا۔

مجسٹریٹ نے ملزم کو پھانسی کی سزا سناتے ہوئے پوچھا :-

" بتاؤ ـــــ تمہاری آخری خواہش کیا ہے ؟"

ملزم نے عرض کیا :-

" حضور! ـــــ میں پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے پہلے فلم
"بازار" دیکھنا چاہتا ہوں ؟"

اس اشتہار کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ اور میں نے محض اسی اشتہار کے اکسانے پر
فلم بازار دیکھی۔ مگر آدھی فلم ہی سے اٹھ کر گھر چلا آیا۔ اور اس اڈورٹائزنگ
ایجنسی کو ایک مشورے کا خط لکھا :-

جناب من ـــ !

میں نے فلم بازار کے بارے میں آپ کا اشتہار پڑھا اور فلم بھی
دیکھی۔ اب فلم دیکھنے کے بعد میں اس اشتہار میں کچھ ترمیم کرنا چاہتا
ہوں۔ امید ہے۔ کہ کل سے اشتہار اخباروں میں آپ یوں شائع کرائیں گے :-

مجسٹریٹ نے ملزم کو پھانسی کی سزا سناتے ہوئے پوچھا:۔

"بتاؤ ــــ تمہاری آخری خواہش کیا ہے؟"

ملزم نے عرض کیا۔

"حضور! ــــ پھانسی تو بڑی اذیت ناک سزا ہے اس کے بجائے آپ مجھے فلم بازار دکھا دیجئے۔ آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا اور میں بھی آرام سے مرجاؤں گا۔"

ظاہر بات ہے کہ اس خط کا کوئی جواب نہیں آیا۔ البتہ مجھے اپنے ڈھائی روپوں کے اس طرح ٹھگ لئے جانے کا بڑا رنج ہے۔ اگر میں نٹ باتھ کے ڈاکٹروں کی نصیحت کے مطابق یہ ڈھائی روپے پان کھا کر تھوک دیتا یا سگریٹ پی کر پھونک دیتا۔ تو جناب دل کو ایک تسلی تو رہتی۔ کہ چلو جی روپے ضائع نہیں ہوئے۔

اس قسم کے عجیب آمیز مبالغے اور مبالغہ آمیز فریب سے بھری ہوئی اشتہار بازی میں اپنے پاکستان اور ہندوستان کے بھائی لوگوں کا نہ تو انگریز مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ امریکن ــــ

اپنے پیارے وطن کے اشتہارات میں مجھے سب سے زیادہ دلچسپ اشتہارات تو صرف دو ہی معلوم ہوئے۔

ایک شادی بیاہ کے اشتہار ــــ دوسرے تجہیز و تکفین کے اشتہار

روزنامہ 'ہرا پاکستان' میں روزانہ اس قسم کے اشتہارات چھپتے ہیں۔

ایک قبول صورت دوشیزہ جس کی عمر اٹھارہ سال ہے، جو میٹرک تک تعلیم پا چکی ہے۔ امور خانہ داری میں ماہر ہے۔ کشیدہ کاری سویٹر بننے اور کیرم کھیلنے میں بڑی مشاق ہے۔ سید زادی ہے۔ اس کے لئے رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکا خوبصورت اور صحت مند اور جوان نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ اس کی ماہانہ آمدنی کم از کم تین سو روپے ہونا نہایت ضروری ہے۔

ایک مہاجر لڑکی کے لئے رشتہ مطلوب ہے۔ یہ لڑکی بے چاری فسادات میں اغوا ہو گئی تھی۔ اب کوئی مسلمان بھائی اس سے بیاہ کر کے اس غریب کی زندگی کی ڈوبتی نیا کو بچا لے۔ لڑکا شادی شدہ ہو تو کوئی بات نہیں۔ شریعت کے مطابق تو چار شادیاں کی جا سکتی ہیں

ان اشتہارات کو پڑھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ کہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی انسانیت کو پھر سے بابل و نینوا اور مصر و بغداد کی شاندار تہذیب کی طرف واپس لئے جا رہا ہے۔ جہاں بازاروں میں نوجوان لڑکیاں منظر عام پر فروخت کی جاتی تھیں۔ وہ طریقۂ کار ذرا زیادہ برا تھا۔ اس لئے بورژوا سماج نے اسی طریقۂ کار کو ایک مہذب شکل عطا کر دی ہے۔ اب بھی لڑکیاں بھرے بازار میں فروخت ہوتی ہیں مگر کتنی عزت و تکریم سے لڑکی کو جہیز سمیت بنا سنوار کر اخبار کے صفحے کے پیچھے چھپا دیا جاتا ہے۔ جس کو خریدنا ہوتا ہے وہ چپ چاپ اخبار کے

صفحے کے پیچھے چلا جاتا ہے

بورژوا سماج میں عورت کا اشتہار اسی طرح دیا جاتا ہے۔ جس طرح عورت عورت نہیں ہے۔ چوئنگ گم ہے، لپ سٹک ہے۔ یا گوڈریج کا سپرنگ دار پلنگ ہے ـــ بازار میں گوڈریج کا پلنگ نوے روپے میں ملتا ہے اور مصباح الدین کی لڑکی تین سو روپے ماہوار میں!

ہائے عورت ـــ! تو کبھی جون آف آرک بھی تھی! تیرا نام زدیا بھی تھا۔

دوسرا اشتہار ـــ تجہیز و تکفین کا اشتہار۔ فدا علی ناصر علی اینڈ سنز ماہران کفن دفن کا ہے۔ جو روزانہ اخبارات میں اس طرح چھپتا ہے۔

اگر آپ کا کوئی عزیز مر گیا ہو تو ہمیں ۲۹۶۶ پر ٹیلیفون کر دیجئے ہم اجرت پر ایسے بہترین طریقے پر آپ کے عزیز کو کفنائیں گے اور دفنائیں گے کہ مرحوم کا آخری سفر نہایت آرام دہ ہو جائے گا ـــ ہماری فرم کا دعوے ہے کہ آج تک کسی مردے نے ہمارے کام اور انتظام کی برائی نہیں کی۔ اگر ممکن ہوتا تو ہم بڑے بڑے نامی گرامی مردوں سے تعریفی سرٹیفکیٹ بھی حاصل کر لیتے لیکن ہم جھوٹ نہیں کہتے۔ ہم بہترین غسل دیتے ہیں۔ بہترین قبریں کھودتے ہیں۔ ایسی قبریں جو سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ایئر کنڈیشنڈ ہو جاتی ہیں۔

ہماری فرم میں بھلیرے، مرثیہ خواں اور نوحہ خواں بھی ملازم ہیں۔
تجہیز و تکفین کا مکمل کورس صرف پچاس روپے میں۔

المشتہر

فدا علی، ناصر علی اینڈ سنز دی بونا فائیڈ کانفرنس اینڈ گریوڈگرس
بالمقابل جامع مسجد، میکلوڈ روڈ۔ کراچی

بورژوا تجارت کی اس حیرت انگیز ترقی کے دور میں ہمیں اتنی آسانیاں ہیں کہ اگر کوئی عزیز مر جاتے تو ہمیں صرف اپنی تجوری یا چیک بک کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کی لاش پر رونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ فدا علی ناصر علی اینڈ سنز کے پاس کرائے کے رونے والے موجود ہیں۔ اور آپ کی طرف سے آپ سے زیادہ دھاڑیں مار مار کر رو سکتے ہیں۔ کیونکہ رونا آپ کا پیشہ نہیں۔ انکا پیشہ ہے۔ مرحوم کی قبر پر روزانہ پھول چڑھانے کے لئے آپ کو تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ فدا علی ناصر علی کے ملازم ہر روز قبر پر پھول چڑھا آتے ہیں اور پھولوں کے دام اور قبر تک آمد و رفت کے اخراجات کا بل۔ دفتر کا روز پیش کر دیتے ہیں۔

دیکھئے دورِ سرمایہ داری میں انسان نے سچ مچ کتنی ترقی کر لی ہے۔ اب ایک انسان پر دوسرے انسان کی تکلیف یا موت غم بن کر کبھی نہیں چھا سکتی سرمایہ داری دوسرے انسان کی مصیبت یا موت کے غم کو آپ کی آنکھ کا

آنسو نہیں بننے دیتی۔ دورِ سرمایہ داری نے آپ کے دل کو گوشت کے فضول لوتھڑے کے بجائے چاندی اور سونے کا سخت اور چمکیلا دل بنا دیا ہے جس پر جو بھی ظلم کرے گا وہ چاندی بنے گا ــــ سونا بنے گا ــــ آنسو نہیں بنے گا ــــ محبت نہیں بنے گا۔

اب ذرا چند اور اشتہارات ملاحظہ فرمایئے:۔

محکمہ راشننگ کے ہیڈ آفس کے آگے ایک اشتہاری بورڈ لکھا ہے۔ جس پر ایک اناج کے گودام کی تصویر ہے۔ جس کے دروازے پر ایک طرہ باز موٹا جاگیردار کھڑا مونچھوں پر بل دے رہا ہے۔ مگر اس کی ٹانگوں کے درمیان سے ایک چوہا پولیس کی وردی پہنے اندر داخل ہو رہا ہے۔ اور نیچے یہ عبارت لکھی ہے۔

چور بازاریوں اور ذخیرہ بازوں کا ــــ پتہ لگانا آپ کا قومی فرض ہے۔

اس اشتہار پر کہاں تک عمل ہوتا ہے۔ اس کا ہمیں علم نہیں۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ جب کبھی کسی نے بلیک مارکیٹ یا ذخیرہ باز کا پتہ لگایا ہے تو اُسے کم از کم راشننگ افسر اور زیادہ سے زیادہ کسی صوبے کا وزیر بنا دیا گیا ہے۔

محکمہ آبادکاری مہاجرین کا یہ اشتہار آپ کو دہلی اور کراچی کی بڑی بڑی شاہراہوں پر نظر آئے گا۔ جس میں ایک لٹے ہارے قافلے کی تصویر ہوگی اور نیچے بڑے دردناک الفاظ میں لکھا ہوگا:۔

یہ آپ کے مہمان ہیں
انہیں اپنے گھروں میں جگہ دیجئے
تاکہ آخرت میں آپ کو جنت میں جگہ ملے!

لیکن چونکہ موجودہ زمانہ مادیت کا زمانہ ہے۔ لوگ کل کی جنت کے مقابلے میں آج کے گھر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس لئے جب مہاجرین یا شرنارتھی سرکاری کیمپوں کے بجائے ہمارے آپ کے گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ تو ہم کہتے ہیں کہ جنت کا دروازہ کل کھولنے سے یہ بہتر ہے کہ آج ہی اپنے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لو — اور پھر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ حکومت مہاجرین کو اور شرنارتھیوں کو گورنمنٹ ہاؤس یا سرکاری کیمپ میں مہمان رکھنے کے بجائے ہمارے تمہارے گھروں کی طرف کیوں ہانک دیتی ہے۔ مہاجرین اور شرنارتھی کیا لیاقت علی اور نہرو کے مہمان نہیں ہیں۔ عبداللہ اور نارائن داس کے مہمان ہیں —؟ اب اس پیدا شدہ سوال کا جواب پیدا ہوتا ہے۔ کہ حکومت کا کام صرف اشتہار بازی ہے اور عوام کا کام مہمان نوازی ہے۔ جس ملک کے عوام جتنے زیادہ مہمان نواز اور حکومت جتنی زیادہ اشتہار باز ہوگی

وہ ملک اور اس کی حکومت جمہوریت کی تاریخ میں بڑی عزت کی مستحق قرار پائے گی۔

جملہ کو ادھورا چھوڑ کر چند اور اشتہار پڑھئے۔ یہ حکومت کی طرف سے تو نہیں ہیں البتہ حکومت کی بڑی حد تک ترجمانی کرتے ہیں۔ آپ نے یہ اشتہار ہر جگہ دیکھا ہوگا:

پاکستان کو مضبوط بناؤ
جہاد کشمیر کے لئے نوجوانوں کو تیار کرنے کا واحد طریقہ
ڈالڈا بناسپتی گھی کا استعمال ہے

یہ اشتہار نہ صرف تجارتی بلکہ سیاسی اہمیت کا بھی حامل ہے یہ اشتہار کا اشتہار ہے اور حکومت کو ایک سیاسی مشورہ بھی ہے کہ حکومت کیوں بیکار میں اپنے بجٹ کا ۶۶ فی صدی حصہ دفاع پر خرچ کرتی ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ ڈالڈا بناسپتی کا سارا اسٹاک پاکستان کے لئے خرید لے تو انشاء اللہ العزیز پاکستان نہ صرف کشمیر فتح کرلے گا۔ بلکہ سارے ہندوستان پر بھی قبضہ کرلے گا۔

دوسرا اشتہار کپڑوں کے ایک بڑے تاجر کا ہے۔ جو یہ ہے:۔

قائد اعظم کا فرمان
اتحاد تنظیم اور عمل

بہترین ورسٹڈ، ٹوئیڈ اور گیبرڈین ـــ ہم سے خریدیئے ـــ ہم ہیں پاکستان میں انگلستان اور امریکہ کے کپڑوں کے سب سے بڑے اسٹاکسٹ۔
حاجی ہدایت علی نظام علی نظام علی اینڈ سنز کلاتھ مرچنٹ، بندر روڈ، کراچی

تیسرا اور آخری اشتہار فلیکس شوز کمپنی کا ہے۔ اس اشتہار میں ہندوستان اور پاکستان کا نقشہ دکھایا گیا ہے اور اس پر فلیکس شوز کو اس طرح دکھایا ہے کہ جوتے کی ایڑی تو دلی پر ہے۔ اور تلا پاکستان پر اور نیچے سوائے 'فلیکس فٹ ویر' کے کچھ نہیں لکھا ہے۔ غالباً لکھنے کی اس لئے ضرورت نہیں تھی کہ یہ اشتہار دیکھنے اور پڑھنے سے زیادہ سمجھنے اور غور کرنے کا ہے۔ میں نے اس اشتہار پر جہاں تک غور کیا ہے اور جتنا اسے سمجھنے کی کوشش کی ہے اتنا ہی مجھے غصہ آیا ہے کہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی ـــ؟ فلیکس شوز کمپنی کو ہماری دونوں آزاد مملکتوں کی آزادی کا اگر مذاق ہی اڑانا تھا۔ تو اس کے اور بھی طریقے ہو سکتے تھے۔ ہماری آزاد مملکتوں نے کب یہ کہا تھا کہ وہ اینگلو امریکن بلاک سے علیحدہ ہونا چاہتی ہیں ـــ مانتا ہوں کہ یہ اشتہار سچائی پر مبنی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہر سچائی کی اس طرح تشہیر کی جائے کہ وہ سراسر جھوٹ معلوم ہو۔

حضور ملکِ معظم کے زیر سایہ اینگلو امریکن بلاک کی یہ دونوں آزاد مملکتیں فلیکس شوز کے اس اشتہار کے خلاف سخت احتجاج کرتی ہیں۔ آپ لاکھ کہیں

کہ یہ توہین نہیں بلکہ "پاپوش عبرت" ہے۔ میں نہیں مانوں گا۔ یہ سراسر ہماری توہین ہمارے ملکوں کی نہیں تو نقشوں کی توہین ضرور ہے۔

آپنے چودھری ظفر اللہ خاں اور سر گوپالا سوامی آئینگر کو ایکسپریس ٹیلیگرام دیں کہ صیانتی کونسل کے کسی قریبی اجلاس میں اس اشتہار کو پیش کر کے فلیکس شو کمپنی کے خلاف فوری کارروائی کا آغاز کریں۔ کیونکہ صیانتی کونسل ایسے ہی اہم متقدمات کے تصفیوں کے لئے قائم کی گئی ہے۔

اور اگر بالفرض اس کا فیصلہ صیانتی کونسل میں نہ ہوا تو پھر قسم ہے تاج برطانیہ کی اس کا تصفیہ میدان جنگ میں ہوگا اور بزور تلوار ہوگا۔

برے ہوڈان کوئیکز وٹ!

~~~~~~ ❁ ~~~~~~
~~~~~~